اقبال اور بچّوں کا ادب

زیب النساء بیگم

اقبال اور بچّوں کا ادب

مصنّفہ
زیب النساء بیگم

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

Iqbal Aur Bachchon Ka Adab

By : Zebun-nisa Begum

سنہ اشاعت جنوری، مارچ - 1992 شک 1913

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا اڈیشن : 2000

قیمت : [redacted] 15/-

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی - 110066

طابع : جے، کے آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لئے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا، ذولسانی اور اردو۔اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہونچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

یہ کتاب بھی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

فہمیدہ بیگم

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

فہرست

۱- پہلا باب	بچّوں کے لئے ادب کی ضرورت	7
۲- دوسرا باب	بچّوں کے ادب کی خصوصیات	31
۳- تیسرا باب	اُردو میں بچّوں کا ادب	79
۴- چوتھا باب	اقبالؔ اور بچّے	123
	الف ۔ نثر	
	۱- بچّوں کے بارے میں	123
	۲- بچّوں کے لئے	143
	ب ۔ نظم	
	۱- بچّوں کے بارے میں	154
	۲- بچّوں کے لئے	164
۵- پانچواں باب	بچّوں کے ادب کا مطالعہ	179
۶- ماخذات		213

بچّوں کے لئے ادب کی ضرورت

بچّے قوم کا مستقبل اور سرمایہ ہیں ۔ اس لیے ان کی عمدہ تعلیم، مناسب تربیت ، اچھی پرورش ، سلیقہ مندانہ نگہداشت اور دیکھ بھال والدین اور اُستاد کا فرض ہے ۔ کیونکہ اسی سے وہ ایسے مہذب شہری بن سکتے ہیں جس کے ذریعہ قوم کی ترقی کی امید کی جاسکتی ہے ۔ لہٰذا والدین اور اُستاد کے لیے بچّوں کی نفسیات کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ دورِ حاضر میں اس علم نے زندگی کے مختلف شعبوں کا احاطہ کر لیا ہے اور انسانی ذہن کی پیچیدہ گتھّیاں سُلجھانے کے لیے اس سے واقفیت نہایت ہی ضروری ہے ۔

یہ ضرورت بچّوں کے ادب کی شکل میں ایک علیٰحدہ اور مستقل حیثیت اختیار کر چکی ہے ۔ آج دنیا میں بچّوں کے ادب کو جو منفرد مقام حاصل ہے وہ صرف ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس میں بچّوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت بھی شامل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بچّوں کے ادب کی اہمیت

کو تسلیم کیا جا رہا ہے جس کا تخلیقی عمل اور مقصد بھی الگ ہے۔

سترھویں صدی میں انگریزی زبان میں ایسی تخلیقات شائع ہوئیں جنھیں بڑوں کے علاوہ بچّوں نے بھی پڑھا اور وہ بچّوں میں اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچّوں کے عالمی ادب میں انھوں نے لافانی سرمایہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس لافانی سرمایہ میں "ڈینٹل ڈیفو" کی تخلیق "رابنسن کروسو" اوّلین حیثیت رکھتی ہے۔

بچّوں سے سبھی پیار کرتے ہیں، لیکن بچّوں کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کی فطرت کے راز آشکار کرنے کی کوشش بالکل نئی ہے۔ مشہور فرانسسی مصنف "روسو" نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ایمل" ۱۷۶۲ء میں شائع کی اور غالباً یہ پہلی کتاب تھی جس نے بچّوں کے جذبات اور خواہشات کے اظہار پر سے پابندی اُٹھانے کا مشورہ دیا۔ اس سے پہلے والدین کی بچّوں سے دلچسپی صرف اتنی ہی تھی کہ وہ ان کی تربیت اس طور پر کریں کہ ان میں فرماں برداری اور ضبطِ نفس وغیرہ کی صفات پیدا ہو جائیں۔ اس مقصد کے لئے انھیں بچّوں کی فطری صلاحیتوں کو سمجھنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ان کی فطرت کی توضیح کرنے والے اسباب بڑوں کی فطرت سے چنداں مختلف نہ تھے۔ ایک ہی قسم کے قوانین کا اطلاق دونوں پر ہوتا تھا۔ اگر ایک کام کو بڑا آدمی آسانی سے سرانجام دے سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی

کام کو بچّہ نہ سیکھ سکے۔ اگر ہم اپنی دلچسپیوں اور خواہشوں کو اپنے ضبط میں رکھ سکتے ہیں تو بچّے بھی ان پر ضبط کیوں نہیں رکھ سکتے۔

"روسو" (۱۷۱۲ء سے ۱۷۷۸ء) نے اس قسم کے خیالات کے خلاف بغاوت کی اور بچّوں کو قدرت کے سُپرد کرنے اور انھیں مکمل آزادی دینے کی حمایت میں عَلَم بلند کیا۔ روسو اور اُس کے سوئیس دوست "پیسو لائنزی (۱۷۴۶ء سے ۱۸۲۸ء) کی تحریکوں سے لوگوں میں بچوں سے حقیقی دلچسپی لینے کا شوق پیدا ہوا۔ ایسا شوق جس کا مقصد بچّوں کی شخصیت سے آگاہ ہونا تھا۔ اس سے قبل تو ادب میں بچّوں کی شخصیت کے وجود ہی سے انکار کیا جاتا تھا۔ لیکن ان تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ بچّے بھی الگ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی مناسب تربیت کے لیے ان قوانین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جو اُن کی فطرت اور شخصیت کو واضح کرتے ہیں۔

جرمن فلسفی "نائڈہین" وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنے بچّے کا اس کی پیدائش سے لے کر تین برس کی عمر تک بغور مشاہدہ کیا اور بعد میں اس کی نشوونما سے متعلقہ یادداشتوں کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے اتباع میں بعض جرمن اشخاص نے بھی اپنے بچّوں کے متعلق اپنے اپنے مشاہدوں کو تحریری شکل دی۔ لیکن یہ تحریریں کچھ زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان "چارلس ڈارون" نے اپنی وہ معرکتہ الارا تصانیف شائع کیں جنھوں نے

تمام مروجہ علوم اور انسانی افکار کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ "بچّوں کا علم" بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈارون نے بچّوں کے متعلق مشاہدات کو بھی کتابی شکل میں پیش کیا۔ اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ بچپن کے زمانے کی اہمیت بڑھ گئی اور اس عہد کو محض بیکاری کا زمانہ تصوّر کرنے کے بجائے جسمانی اور ذہنی نشوونما کی تکمیل کے لیے بنیادی دور قرار دیا گیا۔

بچّے کی تربیت اور ذہنی نشوونما کا پہلا مکتب "آغوشِ مادر" کو قرار دیا گیا ہے۔ جہاں بغیر کسی کتاب کے بچّے کو ذہنی غذا میسّر آتی ہے۔ اُس کے بعد شفیق اُستا کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھتا ہے جہاں "کان اور آنکھ" کی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے نئے ڈھنگ اور نئے ذرائع کا موقع ملتا ہے۔ خصوصاً مشاہدے کے ساتھ مطالعہ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ مطالعہ کا عمل اور اس کے لوازمات بچّے کی شخصیت کو نکھارنے اور بھرپور بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ڈارون کا اثر اگرچہ تمام ممالک کے علماء پر ہوا لیکن انگلستان میں اس کا اپنا عزیز "فرانسس کالٹن سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے انفرادی اختلافات کے علم کی بنیاد ڈالی جسے بچّوں کے سمجھنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔ امریکہ میں "کیٹل" نے ۱۸۹۰ء کے قریب ذہنی آزمائش کو مقبول بنانے کے سلسلے

میں بچّوں کی فطرت کے متعلق بہت سی معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۸۹۳ء میں کلارک یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ "سٹلے ہال" "نیشنل اسوسی ایشن فار اسٹڈی آف چلڈرن" کی بنیاد رکھی اور اس کے فوراً بعد انگلستان میں "چائلڈ اسٹڈی اسوسی ایشن" کے مراکز قائم کئے گئے۔ ایسی تحریکوں کا یہ اثر ہوا کہ اکثر علماء ماہرینِ نفسیات نے بچّوں کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا اور محض مشاہدے کے بجائے علمی اور تجرباتی طریقوں سے کام لیا۔ ایسے منظم مشاہدوں سے "بچّوں کی نفسیات" ظہور میں آئی جس کا مطالعہ نہ صرف والدین بلکہ استادوں کے لیے بھی مفید قرار دیا گیا۔

بچّوں کی نفسیات اگرچہ ایک جدید علم ہے۔ لیکن اس شعبے میں جو تخلیقات ہوتی ہیں ان کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس مختصر سے عرصے میں بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں اور متعدد رسالے بچوں کی تحقیق کے نتائج کے لیے وقف ہوئے۔ وہی بچّے جن کی فطرت سے کوئی آگاہ نہ تھا۔ اب ان کی زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ اور اس پر تحقیق کی گئی۔ فرائڈ اور اس کے پیروؤں نے اپنے ذہنی مریضوں کے مطالعے کے سلسلے میں دریافت کیا کہ ذہنی امراض کے پیدا کرنے میں بچپن کے زمانے کے ناگوار حالات کا بہت دخل ہے۔ بچپن کا طرزِ سلوک بچّوں کی شخصیت کی نشوونما پر گہرا اور مستقل اثر چھوڑتا ہے۔ جس بچّے سے لوگ گھر میں شفقت سے پیش نہیں آتے اور اُس کے فطری

تقاضوں کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے اس کی زندگی کے خوشگوار ہونے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کی تحقیقات نے زندگی کے ابتدائی چند سال کو اتنا اہم قرار دیا ہے کہ شخصیت کی تکمیل ہی ان چند برسوں کے دوران ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زندگی کے ابتدائی چند سال شخصیت کی تکمیل کے لیے بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ بچپن کا درس ہی آئندہ کے ذوقِ مطالعہ کی بنیاد بنتا ہے۔ اس لیے بچّے کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ اس عہد کی نمایاں خصوصیات، واضح رجحانات اور پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔

اُردو زبان کی ہمہ جہت ترقی پر توجہ ہوئی تو بچّوں کی درسی اور غیر درسی کتابوں کی اشاعت کا موقع نکلا۔ نیشنل بک ٹرسٹ، نیشنل کونسل آف ریسرچ اینڈ ٹریننگ اور ترقی اردو بیورو وغیرہ سے بچّوں کے لیے ہر قسم کی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع ہونے لگیں۔ اردو میں بھی بچوں کے لیے نظم و نثر کی تخلیقات دیسی ضرورتوں کے تحت کی گئیں اور یہ بھی محسوس کیا گیا کہ ان کے ذہنی ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے ایسا لٹریچر مہیّا کیا جائے جو دلچسپ بھی ہو اور نصابی کتابوں سے علٰحیدہ بھی۔ اس خیال کے پیش نظر کہانیوں اور نظموں وغیرہ کی کتابیں تیار کی گئیں بعد ازاں رسائل کا بھی سلسلہ شروع ہوا اور بچّے ان رسائل کے ذریعہ دلچسپ کہانیوں، نظموں، معلوماتی

مضامین اور لطائف وغیرہ سے محظوظ ہونے لگے۔

جب یہ بات ثابت ہوچکی کہ بچّوں کی صحیح نشوونما اور شخصیت کی تعمیر کے لیے اس عہد کی نمایاں خصوصیات، واضح رجحانات اور پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے تو علمائے نفسیات نے اس شعبے کے ان مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کی۔

ڈھائی سال سے چھے سال کی عمر کے بچّوں کی فطری صلاحیتوں کو اُبھارنے اور ان کے حقیقی جذبات کو اُجاگر کرنے نیز ان کی نفسیاتی جبلّتوں کی نشوونما کے لیے انگریزی میں اور دیگر ملکی زبانوں میں کافی مواد اور اس کے وسیع ذرائع اور اسباب موجود ہیں۔ مثلاً انگریزی میں "ایکشن گیت" اور "نرسری گیت"، مراٹھی کی "بالواڑیاں" اور گجراتی "بالک نو باریوں"، اور شمالی ہند میں ہندی زبان میں "بالک گیت" بے شمار مل جاتے ہیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان میں ایسا ادب نایاب تو نہیں کم یاب ضرور ہے۔

عیسائی مشنریوں نے نرسری یا کے۔جی (کنڈرگارٹن) کے مدارس ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ہندوستان میں قائم کیے۔ یہ مدارس انگریزی زبان کے تھے۔ انگریزی عالمی زبان ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں نرسری اور کے جی کے مدارس جاری ہیں۔ اس زبان میں چھے سال تک کے بچّوں کے لیے لٹریچر اور ہمہ قسم کا مواد "بچوں کا ادب" کے نام سے موجود ہے اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ملکی زبانوں میں "نرسری" یا "مونیسری" مدراس، گجرات اور بڑودہ میں "بالک نوباری" کے نام سے گجراتی زبان میں ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ شروع کئے گئے۔ اس کے بانی بھاؤ نگر کے بچّوں کے شیدائی اور ہمدردِ اطفال شری گجو بھائی مدھیگا تھے۔ انھوں نے سب سے پہلا نرسری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۲۴ء میں بھاؤ نگر میں قائم کیا اور اس تحریک کو عام کرنے اور گجراتی زبان میں ایک رسالہ کا بھی اجراء کیا اور ستّر، اسّی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھیں۔

مہاراشٹر میں شریمتی تارابائی موڈک جو گجرات میں شری گجو بھائی مدھیگا کی ساتھی تھیں۔ انھوں نے مہاراشٹر میں وہ کام کیا جو گجو بھائی مدھیگا نے گجرات میں کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے بورڈی اور بمبئی اور بعد میں کوساڑہل ضلع تھانہ میں باڑواڑیاں قائم کیں۔ بورڈی میں بال سیویکاؤں کے لیے ہندی زبان میں، پورے ہندوستان کے لیے "کشور باڑسٹ" کی امداد سے ایک ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کے تحت کثیر تعداد میں بال سیویکائیں تربیت پاکر ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آدی واسی بچّوں کے لیے کوساڑہل میں کام ہو رہا ہے آنگن واڑیاں، بال واڑیاں، وکاس واڑیاں اور نرسری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم ہو گئے ہیں۔ مرہٹی زبان میں رسالہ بھی اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے شائع ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں چند اہم کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

یہ ادارہ ایثار و قربانی کا نمونہ ہے۔ مہاراشٹرا میں ۲۴ نرسری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ مرہٹی زبان میں قائم ہیں جن میں صرف اردو ذریعہ تعلیم کا ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ "انجمن خیر الاسلام بمبئی" کی جانب سے کرلا، بمبئی میں جاری ہے۔

بچّے قوم کے معمار ہیں اور آئندہ نسل کی سیرت سازی اُن کے ذمہ ہے۔ اس لیے بچّوں کے ادب میں بے باکی، خود اعتمادی، جملوں کی ترکیب، صرف و نحو سے آگہی، ساتھ مل کر گانے کی عادت، حرکات و سکنات کے ذریعہ جذبات کا اظہار، الفاظ کا صحیح طریقے سے ادا کرنا، عام معلومات میں اضافہ، گیتوں کے ذریعے اور کھیل کھیل میں تعلیم، بچّوں کی طبیعت میں موزونیت پیدا کرنے والے اسباب وغیرہ شامل ہونے چاہئیں کیونکہ مختلف گھرانوں سے آنے والے بچّے جو مختلف مزاج، طبیعت، جسمانی ساخت اور ماحول سے تعلق رکھتے ہیں یا اُنھیں ایک ایسی متوازن شخصیت میں ڈھالا جائے کہ وہ نہ صرف اپنے کنبہ بلکہ ملک و ملّت کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوں۔ "بچّوں کے ادب" کے کسی بھی منصوبہ کی تکمیل میں ایسے اصحاب کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو اپنے علم اور تجربے کی بناء پر اس خدمت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ہر وہ شخص جو اس منصب کا دعویدار ہو بچّوں کا ادیب نہیں کہلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ہر کتاب جس پر بچّوں کے نام کا ٹھپّہ لگا ہوا ہو بچّوں کے ادب کی کتاب سمجھی جاسکتی ہے۔

بچّوں کے عالمی ادب کو سب سے زیادہ ہندوستانیوں نے متاثر کیا ہے۔

سنسکرت کی لافانی تصنیف "پنچ تنتر" کی کہانیوں کی عالمی مقبولیت اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ سنسکرت کی قدیم داستانوں میں تین قسم کی کہانیاں ملتی ہیں۔ پریوں کی کہانیاں، جانوروں کی کہانیاں اور نصیحت آموز کہانیاں۔ ان سب میں جانوروں کی کہانیاں زیادہ مقبول ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں جانور، پرندے اور کیڑے مکوڑے سبھی انسانوں جیسے کام انجام دیتے ہیں اور آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں۔ جانوروں، پرندوں وغیرہ کی ایسی کہانیاں پڑھتے یا سُنتے تو بچّے ایک عجیب اور نئی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جس میں حیرت بھی ہوتی ہے اور تجسس بھی۔ اس کے علاوہ جب وہ ان کرداروں کے ساتھ اپنے جذبات کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں بڑا لُطف آتا ہے۔ "پنچ تنتر" کی کہانیوں میں یہی خصوصیت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے ان کہانیوں نے بچّوں ہی کے لیے نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کہانیوں کو عالمی مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ دنیا کے متعدد ممالک میں پہنچ گئیں۔ "پنچ تنتر" کی تخلیق کا مقصد تھا دلچسپ کہانیوں کے ذریعہ اخلاق اور حکمت کی تعلیم دینا۔ جانوروں کی وساطت سے کہانیاں کہنے کا یہ تجربہ بعد میں جین اور بودھ کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن "پنچ تنتر" کی کہانیاں انسانی سماج اور اس کے وسائل اور عام آدمی کے عارضی رشتوں سے زیادہ وابستہ ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئیں

اور صدیاں بیت جانے پر بھی ان کی دلچسپی باقی ہے۔

اردو ادب میں بھی بچوں کی ضروریات کے مدِنظر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کی مثال ہمیں مولوی نذیر احمد صاحب کے یہاں ملتی ہے جنھوں نے اپنے بچّوں کی اخلاقی بہبودی کے لیے کتابیں تصنیف کیں۔ مولوی صاحب نے بچّوں کی اصلاح اور صحیح اُٹھان کے لیے سنجیدگی سے کہانیاں لکھی تھیں لیکن یہ کہانیاں دادی اماّں یا نانی اماّں کی کہانیاں نہیں بلکہ ان پر مذہب اور اخلاق کا گہرا اثر ہے جو بچّے کی دلچسپی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس طرح کی کہانیوں سے بچّہ خود کو عمر سے بڑھ کر محسوس کرنے لگتا ہے۔

بچّوں کے ادب کی لافانی تصنیف "ڈینٹل ڈیفو" کی "رابنسن کروسو" ہے۔ ڈینٹل ڈیفو ایک قصاب کا بیٹا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا لیکن تھا بڑا ذہین۔ جب اسے کوئی ملازمت نہ ملی تو وہ اخبار بیچنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ نامہ نگار بن گیا، پھر ادیب بن گیا۔ اس نے متعدد کتابیں و مضامین لکھے ایک معاملے میں اسے سزا ہوگئی۔ جیل سے چھوٹ کر باہر نکلا تو جہازراں کمپنیوں میں کام کرنے لگا۔ اس دوران اس نے دنیا کے متعدد ممالک کی سیاحت کی اور ایک دن اسی سفر کے دوران اس کے دماغ میں رابنسن کروسو جہازی پیدا ہوا جو بچپن ہی سے جہازی بننے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کے والد اسے اچھی باتیں بتاتے مگر کروسو کا دھیان جہازوں میں سفر کرنے کی جانب لگا رہتا۔

ایک دن اُسے جہاز کا ایک کپتان مِلا۔ کروسو کی اس سے بڑی گہری دوستی ہوگئی اور اس طرح اُنّیس سالہ کروسو کے سمندری سفر کی رومانٹک اور دلچسپ داستان شروع ہوگئی۔ یہ کہانی جب اشاعت پذیر ہوکر قارئین تک پہنچی تو انھوں نے سوچا کہ یہ یقیناً لکھنے والے کے اپنے ذاتی تجربات ہیں۔ لیکن یہ حقیقت میں ڈینٹل ڈیفو کے تخئیّل کا کمال ہے۔ آج بھی بچّوں کے عالمی ادب میں سیر و سیاحت سے متعلق کتابوں میں رابنسن کروسو کا اہم مقام ہے۔ ڈیفو اس تخلیق کی بدولت لافانی ہوگیا ہے۔

دوسری تخلیق "گلیور کے سفر کی کہانیاں" بھی بچّوں کے لیے نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کا خالق "جوناتھن سوفٹ" ایک مصلح تھا، وہ مذہب کے نام پر غلط رسوم اور عبادات کو رواج دینے والوں کی سخت نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس کے مضامین چھپتے تو تہلکہ مچ جاتا تھا اس کے تیکھے طنز کو قارئین بے حد پسند کرتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ طنزیہ مضامین لکھنے کی بجائے ایک انوکھی اور ان دیکھی دنیا کی کہانیاں لکھنے لگا اور یہ کہانیاں اتنی مشہور ہوئیں کہ دنیا کی دیگر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے اور بچّے "للّی پٹ" کو کبھی نہیں بھولتے۔

اگر سندباد جہازی کے سفروں کا ذکر نہ کیا جائے تو رابنسن مہم جوئی کے دلچسپ سفرناموں کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا۔ اس کہانی نے اپنی

علٰحیدہ حیثیت اختیار کرلی ہے حالانکہ یہ الف لیلیٰ کی مشہور کہانیوں میں سے ایک ہے۔ الف لیلیٰ بھی بچّوں کے عالمی ادب کا ایک بیش بہا خزانہ بن گئی ہے۔ الف لیلیٰ کے مقابلے میں کوئی اور کتاب اس قدر زیادہ نہیں پڑھی گئی۔ اس کی کچھ کہانیاں "علا الدین کا چراغ"، "علی بابا چالیس چور" وغیرہ بھی بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ اس کتاب کی بیشتر کہانیوں کا عہد خلیفہ ہارون الرشید کا دورِ حکومت ہے۔ عرصۂ دراز تک اس کتاب کی کہانیاں زبانی سُنی جاتی رہیں۔ لیکن ۱۷۰۴ء میں ایک فرانسیسی ادیب نے اس مجموعہ کو بارہ (۱۲) جلدوں میں مرتب کرکے شائع کروایا۔ اس کے بعد ۱۸۴۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا اور اب تو دنیا کی لگ بھگ سبھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

اُنّیسویں (۱۹) صدی کے آغاز میں "گریم کی کہانیاں" کی صورت میں دنیا بھر کے بچّوں کو پریوں کی کہانیوں کا ایک بیش قیمت خزانہ ہاتھ لگا۔ گریم برادران کی یہ کہانیاں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ انہیں دنوں ڈنمارک کے ایک ادیب ہنس کرسچین اینڈرسن پریوں کی کہانیاں لکھنے کے سلسلے میں نیا تجربہ کر رہے تھے۔ گریم کی پریوں کی کہانیاں اگر تخلیقاتی دنیا کی سیر کراتی ہیں تو اینڈرسن کا تخئیّل حقیقت کی بنیاد پر کھڑا رہا۔ اس لیے اینڈرسن کی کہانیاں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ اینڈرسن نے چھوٹی چھوٹی

شئے کو بھی زندگی بخش کر اسے جاندار صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اس سے بچّے پریوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ اینڈرسن کی کہانیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں اور آج بھی وہ بچّوں کی قوتِ تخیّل کو بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بچّوں کے ادب میں "ایلس اِن ونڈر لینڈ" کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ بچّوں کے تخیّل کی نشوونما میں یہ کتاب بے حد کامیاب ہوئی ہے اور دنیا بھر کے بچّوں نے اسے پسند کیا ہے۔ اس کے خالق لیوس کیرول نے اپنے حقیقی نام "چارلس ڈکنس" کو پوشیدہ رکھ کر اسے شائع کرایا تھا۔ مگر آج اسی تخلیق کی بدولت ہی اس کا نام زندہ ہے۔

اپنے بچپن کو ناول میں پیش کرنے میں چارلس ڈکنس نے "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" کے ذریعہ مارک ٹوین نے "ٹام سائر" کے ذریعہ بہت شہرت حاصل کی ہے۔ یہ کتابیں بچّوں نے بہت پسند کی ہیں اور آج بہت مقبول ہیں۔

دنیا کے متعدد ممالک میں جہاں یہ تمام تخلیقات پڑھی جاتی ہیں وہاں بچّوں کے طبعزاد اور نئے ادب کی بھی تخلیق ہو رہی ہے۔ آج تمام دنیا کے بچّوں کے ادب کی تخلیق ایک مخصوص بنیاد پر مبنی ہے اور اسے روایت سے ہٹا کر نئے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے بچّوں کے امریکی ادیب لیوس سپرگ نے ہیئر اینڈ نو" عنوان سے جو ادب تخلیق کیا ہے اس میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اب

اساتذہ اور سرپرستوں کا فرض ہے کہ وہ بچّوں کو پریوں کی کہانیاں نہ سنائیں۔ اس سے ان پر بُرا اثر پڑتا ہے اور وہ زندگی کو سمجھنے میں مستقبل میں غلطی کرسکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے ادب کے بجائے وہ بچّوں کو یہ بتائیں کہ دنیا کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟

روس میں میکسم گورکی کی کاوشوں سے بچّوں کے ادب کو سرکار کی ذمہ داری میں شامل کیا گیا ہے۔ وہاں بچّوں کے ادیبوں کے نظریات کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور ان ادیبوں کو دنیائے ادب میں بڑی عزت حاصل ہے۔

آج دنیا کے سبھی ممالک کے بچّوں کا ادب ایک جانب اگر اپنی تہذیب اور روایت سے بڑا ہوا ہے تو دوسری طرف جدید نظریات کے ذریعہ نئے سماج سے جُڑنے کے لیے کوشاں ہے۔ سبھی ممالک اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعور کے مطابق بچّوں کی نشوونما چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچّے حقیقت کے محور سے دور ہٹ جائیں یا روایت کے چکّر میں آگے بڑھنے سے رہ جائیں۔ اس لیے بچّوں کے ادیبوں کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اس جانب زیادہ سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہئے تاکہ بچّوں کو زیادہ حقیقت پسندانہ اور دلچسپ ادب پڑھنے کو میسّر آسکے۔

ذاکر حسین ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیّہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ بنے تو ان کی

رہنمائی میں جامعہ نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں نئے عزائم کے ساتھ شروع کیں۔ بچّوں کی تعلیم اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اس وقت بہت کم تھے ۔ بچّوں کے لیے نظمیں تو لکھی جانے لگیں تھیں لیکن نثر کا میدان کہیں کہیں خالی تھا ۔ صرف مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی درسی کتابیں ہی بچّوں کا اپنا سرمایہ کہی جاسکتی تھیں ۔ ذاکر صاحب نے ایک معلّم اور مفکّر کی حیثیت سے بچّوں کی تعلیم کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا اور اردو میں بچّوں کے ادب کی ترویج و اشاعت کو ایک اہم تعلیمی ضرورت قرار دیا۔ اسی سال رسالہ "پیام تعلیم" جاری ہوا۔ وہ جامعہ کا پیام تعلیم بن کر نکلا تھا مگر کچھ ہی عرصہ میں بچّوں کا پیام تعلیم ہوگیا۔ جامعہ غالباً پہلی درس گاہ ہے جس نے بچّوں کے ادب کی طرف توجہ کی تعلیم و نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں اپنی کتابیں تیار کرنا شروع کیں جو ہر لحاظ سے بچوں کے لیے تھیں ۔ بچّوں کے لیے قصّے کہانیاں لکھنا عام طور پر چھوٹوں کا کام سمجھا جاتا ہے ۔ بڑے اور مشہور ادیب بالعموم اسے اپنی حیثیت سے فروتر سمجھتے تھے ۔ اس وقت تو اس کا چلن بھی نہیں تھا ۔ جامعہ کے اساتذہ نے اس روایت سے بغاوت کی اور بچّوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ لکھنے لگے۔ پیامِ تعلیم نے اپنے نام اور کام کو ایک کر دکھایا ۔ ذاکر صاحب کی بیشتر کہانیاں مختلف اوقات میں اسی رسالے کی بدولت لکھی گئیں ۔ ان کہانیوں کی تعداد اگرچہ کم ہے تاہم بچّوں کے ادب کی ضروریات کے جملہ اہم مقاصد کو پورا کرتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ارادی طور پر مختلف نمونے سامنے لا رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی کہانیاں ایک استاد اور ماہرِ تعلیم کے احساسِ منصبی کے تحت وجود میں آتی ہیں جو حُسن اتفاق سے اپنے سینے میں ادیب بھی چھپائے ہوئے ہے۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی[1] نے جو درسی کتابیں ترتیب دی ہیں ان میں بچّوں کے ادب کی ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے "اردو کی دوسری کتاب" میں سبق کے آخر میں مشق کے طور پر "یاد کرو۔ ہجّے اور معنی" کے تحت چند مشکل الفاظ دیئے ہیں۔ اس سے بچّوں میں الفاظ کو معنی کے ساتھ یاد رکھنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور لکھنے میں اِملا کی غلطیوں کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ اس درسی کتاب کا پہلا سبق "خدا کی خلقت" ہے۔ اس کتاب میں مختصر اخلاقی کہانیاں بھی شامل ہیں جن میں اخلاقی درس ہے۔ لیکن بعض نظمیں انگریزی کہانیوں سے اخذ کی گئی ہیں، بعض کہانیاں فارسی سے لی ہیں۔ حکایتوں کو شامل کرنے سے بچّوں کو تعقل کی منزل پر مناسب ذہنی غذا ملتی ہے۔ مثلاً ایک حکایت حکیم لقمان سے منسوب ہے جس میں "جو بوؤ گے وہ کاٹو گے" اس کا ماحصل ہے۔ اس طرح بچّوں کو اردو ادب کے قدیم شہ پاروں سے واقفیت ہو جاتی

---

[1] اسماعیل میرٹھی۔ حیات اور شخصیت۔ ڈاکٹر سیفی پریمی۔

ہے اور ان کے فیض سے وہ اتنا ضرور محسوس کر سکتے ہیں کہ "بچّوں کی دنیا" سے بزرگ شاعروں نے دلچسپی لی ہے۔ اس کتاب میں جذبے کی تزئین، اخلاق کی تربیت، ذہن کی بالیدگی، کردار کی خوشنمائی، ذکاوت و ذہانت کی راہِ فطری مناظر، دیہی اور شہری ماحول، صحت مندی، عام معلومات، آدابِ مجلس، پسندیدگی شعر و دلچسپی وغیرہ اتنی بھرپور چیزیں شامل ہیں کہ بچّوں کے لیے ادب کی ضرورت لازم ہو جاتی ہے۔

اسمٰعیل[1] میرٹھی کی ترتیب دی ہوئی "اردو کی پانچویں کتاب" کا آغاز "خدا رازق ہے" سے ہوتا ہے۔ اس کتاب میں نظم کا حصّہ غالب ہے۔ اردو ادب کی مقبول صنف یعنی غزل بھی شامل ہے۔ مولانا نے سر جان لابنس، ارسطو، شارپ کے حالات لکھ کر بچّوں کو عام بہبود کے کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ حکومتِ آزادی اور غلامی کے تصوّرات سے واقفیت بہم پہنچاتی ہے۔ اس سلسلے میں "غلامی کا انسداد" اہم مضمون ہے جس میں ۱۸۳۴ء میں شارپ کی جدوجہد سے انگلستان میں غلامی کی رسم ختم ہونے کا بیان ہے۔ ان کے علاوہ ٹھوس علمی مضامین شامل ہیں۔ مثلاً تحقیق، حکومت، ستارے، کہکشاں، ہوا اور آسمان، حواس خمسہ وغیرہ۔ اس کتاب میں

---

[1] اسماعیل میرٹھی۔ حیات اور شخصیت۔ ڈاکٹر سیفی پریمی۔

توہم پرستی کا اثر بچّوں کے ذہن سے دور کرنے کے لیے دو نہایت ہی اہم دلچسپ اور انوکھے مضمون شامل ہیں۔ ایک "بکری کا بھوت" اور دوسرا "باجے کا بھوت"۔

بچّوں کے لیے ادب کی بے حد ضرورت ہے۔ اس لیے بچّوں کے لیے ایسا ادب مہیّا کیا جائے جو بچّوں کی سیرت سازی میں موثر اور مفید ثابت ہو۔ بچّوں کے ذہن پر انصاف، فرض شناسی، ایفائے وعدہ، محنت کی روزی، حسن سلوک، رفاہ عام، قومی یکجہتی، ذہانت، شجاعت، مساوات، وفاداری، پاسداری، علم و فضل کی عظمت، روشن خیالی وغیرہ جیسے اوصاف کا نقش مرتسم ہو سکے۔

بچّوں کے مسائل بہ ظاہر بہت معمولی اور آسان نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ چھوٹے چھوٹے مسائل بھی اُن کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بچّے جھوٹ اور سچ، اچھے اور بُرے، خوشی اور غم، انصاف اور ناانصافی، کے خیالی فرق کو سمجھ تو لیتے ہیں لیکن اس کے عملی پہلو کو سمجھ نہیں سکتے جو بڑوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ بچّوں کے لیے لکھی جانے والی سبق آموز کتابوں سے ان پر یہ باتیں واضح کی جا سکتی ہیں اور سیدھے سادے طریقے سے بتائی ہوئی باتیں اُن پر اثر انداز ہو سکتی ہیں اور ایسی کتابوں سے بچّوں کو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سچّی اور بے غرض محبت کا صلہ ہمیشہ آخر ہی میں ملتا ہے۔ جھوٹے اور خراب لوگ لالچی، حاسد اور بدگمان ہوتے ہیں۔ یہی چیزیں ہیں جنھیں بچّے جاننا چاہتے ہیں۔ بچّے شعوری

طور پر اس بات کو محسوس نہیں کرتے۔ وہ اپنے بلا امتیاز مطالعہ سے پریوں کی کہانیوں، مزاحیہ قصوں اور سیر و تفریح کی داستانوں وغیرہ میں سچّائی ڈھونڈتے ہیں جو ان میں خوشی اور جوش کی گرمی پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ بات یہاں قابلِ ذِکر ہے کہ بچّے جو اِن کہانیوں کو پڑھتے ہیں یہ جان لیتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے اس کی سچّائی کو وہ اپنا بھی سکتے ہیں۔ بچّوں کی عمدہ کتابوں میں ٹھوس بنیادیں ہونی چاہئیں، زندگی کے حقائق ہونے چاہئیں اور یہ نصیحت کی خاطر ہی نہیں بلکہ اس لیے کہ ان حقائق کو لے کر بچّہ آگے بڑھے۔ مصیبت کے وقت ان کا سہارا لے سکے اور طوفانوں میں اپنی کشتی پار لگا سکے۔

اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچپن کے تجربوں کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ بچپن ہی کا زمانہ زندگی کے بننے اور سنورنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں بچّے چیزوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ بہت کم مدّت کا ہوتا ہے لہٰذا اس قیمتی وقت کو جس میں آئندہ زندگی کی بنیاد رکھنی ہے یونہی ضائع نہ ہونے دیا جائے اور بچّے کی شخصیت کے بنانے کی سب سے اہم منزل کو فضول اور عام مذاق کی کتابوں کے پڑھنے میں تضیع اوقات کا موقع نہ دیا جائے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچّے بھی بڑوں کی طرح مطالعہ کرتے ہیں۔ اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں کہ وہ کیا پڑھتے ہیں یہ ضرور ہے کہ بچّے بڑے ہو کر بھی پڑھتے رہیں گے اور بعد میں اچھی کتابیں بھی

پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن جس بچّے نے اپنے بچپن میں بہترین ادب پڑھ لیا اس نے اپنے بننے سنورنے والی منزل میں ایک نیا تجربہ بھی حاصل کر لیا اور اپنی آئندہ زندگی کو اس بنیاد پر بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ لہٰذا اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ بچپن ہی سے بچّوں کو بہترین ادب سے روشناس کرائیں تاکہ وہ آئندہ بھی اچھے ادب کی جانب مائل رہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ بچّوں کا ادب ہوا میں معلّق ہے اور اس کی کوئی مقررہ قدریں نہیں ہیں۔ جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ بچّوں کے ادب اور بڑوں کے ادب، دونوں کی قدریں مشترکہ ہیں۔ اس لیے اردو میں بچّوں کے ادب کی ایک نمایاں حیثیت ہونی چاہیئے۔

سی۔ ایل۔ لیوکا کہنا ہے "وہ ادب معیاری نہیں جس سے ہم دس سال کی عمر میں تو لطف اندوز ہو سکیں مگر پچاس سال کی عمر میں نہ ہوں۔ ادب کے معیاری ہونے کا ثبوت یہی ہے کہ ہر عمر اور ہر زمانے میں لوگ اس سے لُطف اندوز ہوں[1]"

بچّے اور بڑے کے لُطف اندوز ہونے میں اس کے تجربات کی وجہ سے کچھ فرق ضرور ہوگا مثلاً الفاظ کا انتخاب، اسلوب بیان وغیرہ۔ بچّے ان چیزوں کو الگ الگ تو محسوس نہیں کرتے لیکن اسلوب بیان اور الفاظ کی خوبصورتی سے

---

[1] بچّوں کے ادب کی خصوصیات۔ مشیر فاطمہ۔

وہ غیر شعوری طور پر متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ ہمیں بچّوں کے ادب کا جائزہ اس طرح لینا چاہئے کہ ہم اسے بچّوں کا ادب سمجھیں اور انہیں کتابوں کا جائزہ لیں جو معیاری کہلانے کی مستحق ہیں۔ ہمیں اسے بھی اپنی زبان کے ادب کا بہترین حصّہ سمجھنا چاہئے۔

ہمارے ادیبوں کی یہ ناانصافی ہے کہ وہ بچّوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ انھوں نے بچّوں کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان کے لیے معیاری ادب تخلیق کیا جائے۔ اچھے اور بُرے ادب میں تمیز کرنے کی امید ہم بڑوں سے بھی اس وقت کر نہیں سکتے جبکہ انھیں بچپن میں اچھا ادب پڑھنے کو میسّر ہی نہیں آیا ہو۔ بچّوں کے ادب کی تخلیق بھی ایک فن ہے۔ اس کو صرف ایک ذریعہ نہیں بنانا چاہئے بلکہ اس کا ایک مقصد ہونا ضروری ہے۔ کتاب حقائق اور واقعات کا پلندہ نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کا ایک دلچسپ ذریعہ ہوتی ہے۔

بچّے کے لیے کوئی بھی کتاب اس لیے اچھی ہوتی ہے کہ وہ اس کے لیے تجربے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ جب بچّہ کسی کتاب کو پڑھ کر لُطف اندوز ہوتا ہے تو وہ کچھ آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کی حیثیت میں بہ حیثیت ایک فرد کے کچھ اضافہ ہوتا ہے اس طرح اس میں آئندہ نئے احساسات سے لُطف اندور ہونے اور نئے خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بچّوں کے ادب کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور کی اچھی کتابیں تو باقی رہ گئی ہیں اور

بیکار کتابیں اس زمانے کے ساتھ ہی ختم ہوگئیں ۔ اُنیسویں صدی میں جب یورپ میں مذہبیت کا زور تھا تو اس زمانے میں پند و نصاح سے بھری کتابیں لکھی گئیں جو اُسی دور کے ساتھ ختم ہوگئیں ۔ بچّوں کے ادب کے لیے ایک معیار قائم کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ آج کل کی کاروباری دنیا میں بچوں کا ادب تعلیم اور ادب کی خاطر نہیں بلکہ روپیہ کمانے کی خاطر لکھا جاتا ہے ۔ اچھا ادب وہی ہے جو بچّے کے ذہن کو زیادہ متاثر کر سکے جس کے پڑھنے سے اس کو سچّی خوشی حاصل ہو۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تھوڑا بہت معمولی قسم کا ادب پڑھنے سے بچّوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ لیکن ایسا کہنا غلط ہے ۔ کیونکہ ادب اچھا ہو یا بُرا، کارآمد ہو یا فضول، اس کا اثر بچّوں پر ضرور پڑتا ہے کیونکہ بچّوں میں فطری طور پر تجسّس اور تلاش کا مادہ زیادہ ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ بچپن کا زمانہ جس کی مدّت زندگی میں بہت تھوڑی ہوتی ہے، بہت اہم اور قیمتی زمانہ ہے ۔ اس زمانے میں تھوڑا سا بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے ۔ بچّہ زیادہ حسّاس ہوتا ہے وہ ہر چیز کا اثر جلد قبول کر لیتا ہے ۔ جس زمانے میں بچّے کی صلاحیتیں لامحدود ہوں ہم بچّے کو اس کی صلاحیت سے کم تر چیز کیوں دیں ۔ اس زمانے میں تو وہ چیزوں کو پہچانے گا، ان کی قدر کرے گا، ان سے لُطف اندوز ہوگا اور ان تمام چیزوں کو اپنی نشوونما کے لیے استعمال کرے گا ۔ اس لیے بچّوں کو ایسا ادب مہیّا کیا جائے جو اس کی شخصیت سازی

میں ممد و معاون ثابت ہو۔ ان باتوں کے پیشِ نظر بچّوں کے لیے عمدہ اور کار آمد ادب کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔

بچّوں کو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن کا مطالعہ شروع ہی سے ان میں اچھے اور بُرے ادب کی تمیز پیدا کر سکے اور وہ بتدریج ان کو اس قابل بنا سکیں کہ وہ اپنی ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے ادبی سرمایہ سے بھی محظوظ اور مستفید ہو سکیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ابتدا ہی سے زبان کے کلاسیکی ادب کو اختصار کے ساتھ آسان زبان میں ڈھال کر ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ آگے چل کر انھیں ترجموں کے ذریعہ دوسری زبانوں کے بچوں کے ادب اور کلاسیکی ادب سے بھی روشناس ہونے کا موقع دیا جائے۔ ایسے ادب سے بچّوں میں ابتداء سے ہی وہ شعور پیدا ہو سکے گا جس کی بناء پر وہ ملک کے اچھے شہری بن سکیں گے اور آرٹ اور سائنس میں ترقی کے ساتھ ملک میں اتحّاد کی روح پھونک سکیں گے۔ ان کے کارنامے حق اور صداقت پر مبنی ہوں گے اور وہ اپنی سیرت کی خوبی سے فخرِ روزگار اور عالمِ انسانیت کی بھلائی کی رُو سے باعثِ افتخار ہوں گے۔ کسی قوم کی بقا و ضمانت اور مستقبل کی اُمید اُس قوم کو نونہال تصوّر کئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بچّوں کے ادب کی ضرورت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرا باب

بچّوں کے ادب کی خصوصیات

بلاشبہہ بچّوں کے ادب کو ان قدروں اور خصوصیتوں کا حامل ہونا چاہئے جو کسی بھی زبان کے نظم و نثر کو ادب کا درجہ بخشتی ہیں ۔ ان میں خیال کی رفعت، جذبہ کی صداقت، زبان کی لطافت اور بیان کا حُسن بخشتی ہیں۔ کوئی بھی تحریر جو دل کو چھو لینے والی کیفیت اور تاثیر سے محروم ہو ادب میں شامل نہیں ہو سکتی ۔ بچّوں کا ادب اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ بچّوں کی جمالیاتی حِس کی تسکین ان کی تربیت اور نشو و نما اس کا بنیادی مقصد ہونا چاہئے ۔ اس طرح ادب چاہے کسی زبان اور کسی زمانے کا ہو اگر اس میں عالمگیریت (Universal Appeal) ۔ کا عنصر موجود ہے تو وہ عظیم ادب ہے جو انسانوں اور انسانی برادری اور بھائی چارہ کا احساس پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے ۔ بچّوں کے ادب کی عظمت اور افادیت کا راز بھی اس آفاقی اپیل میں پوشیدہ ہے ۔

صرف کھیل ہی کھیل کے سامان کو بچّوں کے ادب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور پند و نصیحت کے پلندے کو بھی کچھ اور تو کہا جا سکتا ہے لیکن بچّوں کی دلچسپی

اور دل لگی کا سامان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بچّوں کا ادب خواہ درسی ہو یا غیر درسی اس کی تیاری میں بعض امور کا خاص خیال ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ کس عمر کے بچّوں کے لیے کس مقصد سے کیا لکھنا مقصود ہے وہ بچّے عام طور پر کیسے اور کس ماحول اور کس فضا میں پرورش پا رہے ہیں اور انھیں کن اعلیٰ اقدار، مسائل اور موضوعات سے روشناس کرنا ہے۔ طبعی اور نفسیاتی طور سے ان کی عام ذہنی سطح کا معیار کیا ہے۔ اعلیٰ کامیاب اور مِل جُل کر زندگی بسر کرنے کے لیے اُن کے خیالات کی تربیت کس نہج پر ہونی چاہئے۔ موضوع اور مقصد کا نہیں، زبان کا معیار، اسلوب کی موزونیت، ذوقِ ادب کا تدریجی ارتقاء، زندگی اور زمانے کی ضرورتوں کا احساس غرض مجموعی طور پر بچّوں کی تعمیرِ سیرت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اردو زبان میں ادب اور اخلاق پر تو وافر ذخیرہ موجود ہے مگر سائنس کے وہ نئے نئے علوم جو منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور جن کی طرف سے زندگی کی جد و جہد میں صرف نظر ممکن نہیں۔ بچّوں کی عمر اور ان کی ذہنی استعداد کے مطابق ایسی سائنسی کتابوں کی تیاری کی ازبس ضرورت ہے۔ ان کتابوں کی تیاری اس طرح ہو کہ سائنس کے ابتدائی ضروری مسائل تدریجی طور پر نصابِ اردو میں شامل کیے جائیں اور ایسی امدادی کتابیں بہت بڑی تعداد میں مہیّا ہوں کہ ابتدائی تعلیم ہی کی مدّت میں مطالعہ کا شوق، غور و فکر کی عادت، مشاہدہ قدرت اور عملِ زندگی کے تجربے بچّوں کے محبوب مشغلے بن

جائیں ۔ظاہر ہے کہ یہ کام کسی فردِ واحد کے بس کا نہیں، البتہ ادب اور سائنس کے باہمی اشتراک سے بچّوں کا ایسا ادب مہیّا ہو سکتا ہے۔

بچّوں کا ادب اگر واقعی بڑوں کے ادب سے کوئی مختلف چیز ہے تو اسے اسی نظریئے سے دیکھنا چاہیئے ۔بچّوں کے اردو ادب میں ایسی نثر اور نظم کی کتابوں کی تعداد ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ہے، جن سے بچّوں کو ہمہ جہتی میں ترقی مل سکے ۔بچّوں کے ادب میں نثر ہو یا نظم ہر نوع کی تحقیق بڑی محنت چاہتی ہے ۔بچّوں کی ایسی تخلیقات میں شاعرانہ تخیّل، تشبیہات اور استعارات، اشارات و کنایات، غرض تکلّفات اور تصنیفات سے زیادہ سلاست اور وضاحت کی ضرورت ہے۔بچّوں کے لیے ادب میں ان عناصر کی بتدریجی شمولیت سے انکار نہیں مگر یہ بات زیادہ احتیاط اور محنت چاہتی ہے ۔بچّوں کے ادب میں چونکہ خاص نقطۂ نظر پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اس لیے آمد سے زیادہ آورد ناگزیر ہے ۔ البتہ کوشش یہ ہو کہ آورد میں آمد کا لُطف آئے اور ہر صنف میں بے ساختگی اور دلکشی اپنا جلوہ دکھائے ۔

درویشوں، مقدس مقاموں ، مندروں وغیرہ پر کتابیں ہونے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی زندگی کے تقاضے اور روزمرہ حقیقت سے متعلق بھی بچّوں کے لیے کتابیں لکھی جائیں ۔ ابھی تک یہ ہوتا رہا ہے کہ بچّوں کی کتابوں کے لیے فارسی، سنسکرت اور عربی سے حکایتیں لی جاتی رہی ہیں اور اس میں کوئی تبدیلی

نہیں لائی جارہی ہے۔ یا دیوؤں اور پریوں سے متعلق گھڑے ہوئے قصّے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بچّوں کی ذہنی نشوونما اور بالیدگی کے لیے کچھ اور ہی چاہیئے۔ ہمیں یوروپی ملکوں کے بچّوں کے ادب پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ ہمارے بچّوں کے ادب کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ کارآمد ہیں۔ دنیا میں کہانیوں کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ مصر و بابل کے افسانے، ایسپ کی کہانیاں کافی مشہور ہیں۔ عربی اور فارسی قصّوں کا اردو سے براہ راست تعلق ہے۔ تقریباً تمام مشہور قصّوں کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے فارسی قصے اُردو سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ بچّوں کے ادب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچّے کی سیرت بنانے میں موثّر ثابت ہو۔

بچّوں کی نہ ختم ہونے والی جستجو، شعر پسند طبعیت، اپنے ماحول کے متعلق جاننے کی خواہش اور انجان چیزوں کے بارے میں جاننے کے لیے ان کی پروازِ تخیّل سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بچّہ کس قسم کی کتاب چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ خود اُسے کون سی کتاب چاہیئے۔ وہ بذریعہ کتاب اپنے نہ ختم ہونے والے سوالوں کا جواب، اپنی دنیا کی سیر اور اپنے تجسّس کی خواہش پوری کر لیتا ہے۔

کتاب معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور بچّے جب پڑھنا سیکھ لیتے ہیں تو کتابوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ جو تجربہ کتاب سے حاصل

ہوتا ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ بچّوں کی زندگی کا تجربہ اپنے ماحول تک محدود رہتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول سے باہر کی دنیا کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا بہترین اور واحد ذریعہ کتاب ہے ۔ دنیا کے وہ حصّے جو اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں ان میں پرواز کا ذریعہ کتاب ہے جو پَروں کا کام دیتی ہے ۔ جو چیزیں انھیں پسند نہیں آتیں انھیں پڑھنے کے لیے بچّوں کو مجبور نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنے حقِ انتخاب کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں ۔ وہ خود نہیں جانتے کہ ان کو کوئی خاص کتاب کیوں پسند ہے ۔ وہ منطقی طور پر سوچنے کے عادی نہیں ہوتے ان کے فیصلے کی بنیاد سچّی خوشی پر ہے ۔ جو کتاب انھیں پسند نہیں ہوگی وہ اسے بے دلی سے پڑھیں گے ۔

اگر بڑوں کو بچّوں کے ادب کے متعلق صحیح معلومات نہ ہوں، ان کی پسند اور ناپسند کا صحیح اندازہ نہ ہو تو کتاب سے بچّے کی دلچسپی اور مطالعہ کا شوق ختم ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ بچّے کے مطالعہ کا انحصار ان چیزوں پر ہوتا جو اسے پڑھنے کو ملتی ہیں ۔ یعنی بڑے ان کو کس قسم کتابیں مہیّا کرتے ہیں ۔ ہم اپنے بچپن کی صلاحیتوں اور مثلاشی نظروں کو بھول جاتے ہیں اور بچّوں کی داخلی صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ سائنس کی اس دنیا میں ہم بچّے کی صلاحیت، ذہانت اور اس کا ذخیرۂ الفاظ اور اس کے تجسّس کا وہ جوش جس کی حد ہی نہیں ہے ناپ تول کر کتاب تجویز کرتے ہیں جس سے بچّے کی وہ صلاحیت

ضائع ہوتی ہے جو کسی عمر اور ترقی کے پیمائش کی پابند نہیں ہوتی۔ بچّے سیماب صفت ہوتے ہیں۔ وہ خاموش نہیں رہتے اور کتابیں ایسی پسند کرتے ہیں جس میں چیزیں اور واقعات وغیرہ بدلتے رہتے ہیں اور ذہنی اور جسمانی عمل ہوتا رہتا ہے۔ ایسی کتابیں جس کے مطالعہ سے بچّوں کے تخیّل میں وسعت نہ ہو، جو ان کے ذہن کو آگے نہ بڑھا سکیں ان کے پڑھنے سے نہ صرف ان کا وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ اُن کو ہمیشہ کے لیے ایک جگہ روک دیتا ہے۔ اس لیے جس کتاب میں بچّوں کو دلچسپی نہیں ہوتی اور جس سے ان کو اطمینان نہیں ملتا، جس سے ان کی دماغی قوت نہیں بڑھتی اس کو وہ چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی نشوونما کے لیے دوسرے ذرائع تلاش کر لیتے ہیں۔ بچّوں کے ادب میں صرف وہی کتاب شامل ہو سکتی ہے جس میں بچّے کو ذہنی طور پر آگے بڑھنے اور ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لیے کافی مواد ہو۔

جس طرح بچّہ جسمانی اعتبار سے مختلف منازل سے گزرتا ہے اسی طرح مطالعہ میں بھی مختلف منازل طے کرتا ہے۔ بچپن کا درس ہی آئندہ کے ذوقِ مطالعہ کی بنیاد بنتا ہے۔ بچّہ پریوں کی کہانیوں سے بادشاہوں کی کہانیوں اور پھر چاند ستاروں کی کہانیوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لیکن پریوں کی کہانی سے بچّے کا جو تخیّل نشوونما پایا تھا وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ بادشاہوں کی کہانیوں سے انسانی تاریخ کا پتہ چلے گا، چاند ستاروں کے قصّوں سے اسے

کائنات کے متعلق علم ہوگا اور یہی شوق آئندہ مطالعہ کی بنیاد بنتا ہے اور معلومات میں اضافے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کتاب صرف حقائق اور واقعات کا پلندہ ہی نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہونی چاہیئے۔ بچّوں کے ادب کی تخلیق بھی ایک فن ہے۔ بچّوں کے ادب کا اپنا مقصد ہونا چاہیئے اس کو صرف ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔

بچّوں کا اچھا ادب بھی سنجیدہ تحقیق کا مستحق موضوع ہے۔ ہر قسم کے ادب میں اچھا، خراب اور معمولی ادب ہوتا ہے۔ اس لیے بچوں کے ادب کی بھی خاص اہمیت ہے۔ بعض کتابیں ایسی بھی شائع ہوتی ہیں جو صحیح معنوں میں بچّوں کا ادب کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ بچّوں کے ادب کا کوئی معیار قائم کیا جائے تاکہ کارآمد اور فضول کتابوں میں تمیز ہو سکے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج کل بچّوں کے ادب کے نام سے بیشتر کتابیں علم و ادب کی خاطر نہیں روپیہ کمانے کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔

بچّوں کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے اور یہ انفرادی فرق بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جس سے بچّے کا ذہن زیادہ متاثر ہو۔ جس کے پڑھنے سے اس کو سچّی خوشی حاصل ہو۔ اچھی تحریر کی بنیادی خصوصیات اس کی ادبی قدریں ہیں جو مواد سے نہیں بلکہ فن سے بنتی ہیں۔ انگریزی کی مشہور کتاب

"رابنسن کروسو" کی شہرت سے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ دور دراز جزیرے کے قریب جہاز کا ڈوبنا ایک دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے اور بہت سے ادیبوں نے اس پر طبع آزمائی کی مگر سب وقت کے ساتھ ختم ہوگئیں اور رابنسن کروسو دو صدی بعد آج بھی اتنی ہی مقبول اور اپنی نوعیت کی بہترین کتاب ہے۔ ہر آدمی اپنی بات الگ انداز سے کہتا ہے۔ اس سے اس کی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ادیب اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرے کہ پڑھنے والا بچّہ مصنف کا ہم خیال بن جائے اور اسی طرح محسوس کرنے، سوچنے اور سمجھنے لگے۔ اگر ادیب کا اپنا نقطۂ نظر نہیں ہے تو اس کتاب میں کوئی انفرادیت نہیں ہوگی۔ وہ کوئی مقصد پیش نہیں کر سکے گی، کوئی پیغام نہیں دے سکے گی۔ اس کا کوئی مرکزی خیال نہیں ہوگا۔ بچّوں کے ادب کی سب سے بڑی خوبی تنوّع ہے۔ موضوع چاہے پریوں کی کہانی کا ہو، جانوروں کی کہانی کا یا کسی ہیرو کی سوانح حیات، بچّوں کا ادب کہلانے کی مستحق اس وقت ہوں گی جب اس میں اچھی تحریر کی خوبیاں موجود ہوں۔

موضوع کے اعتبار سے بچّوں کے ادب کو اچھا یا بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہیرو کی کہانی ایک پری کی کہانی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ یہ خیال کہا جاتا رہا ہے کہ بچّوں کے لیے معلومات خیز کتابیں بہت مفید ہیں کیونکہ ان کو پڑھ کر بچّے بہت سی ایسی معلومات حاصل کرتے ہیں جو ان کی

آنے والی پُر پیچ اور دانشور زندگی میں ہر ہر قدم پر کام آسکتی ہیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ بچّے میں تجسّس کا مادہ اس قدر شدّت سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی دلچسپی کی ہر چیز سے متعلق خود معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بچّوں کے ادب میں تخیّلی کتابوں کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ اس سے ذہنی نشوونما ہوتی ہے اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود سے بڑی چیز سے دوچار ہو تاکہ اس کے ذہن میں وسعت پیدا ہو اور تخیّل کی طرف مائل ہو۔ جن کتابوں میں تخیّلی موضوع ہو وہ اچھے ادب سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، ان میں اچھے ادب کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ادیب کے خیالات، اس کی تحریر کا خاکہ، اس کا اسلوبِ بیان، یہ چیزیں بڑی حد تک کتاب کی ادبی حیثیت طے کرتی ہیں۔ بچّوں کے ادب میں ان چیزوں کا اضافہ بے حد ضروری ہے۔ کہانی کے اعتبار سے ہم کو اس کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ کوئی کہانی بنیادی خیال کے بغیر نہیں بڑھ سکتی چاہے وہ خیال کتنا ہی روایتی اور فرسودہ کیوں نہ ہو مثلاً جانوروں کے ساتھ ہمدردی کرنا وغیرہ کیونکہ وہ ہمارے دوست ہیں۔ اکثر ادیب بچّوں کی اصلاح کرنا فرض تصوّر کرتے ہوئے اصلاحی موضوعات پر زور دیتے ہیں اکثر و بیشتر کہانیوں

یں اپنے خیالات کا پرچار کرتے ہوئے بچّوں کی دلچسپی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

بچّوں کے ادب کے متعلق ادب کے مختلف ادوار میں مختلف رائیں رہی ہیں۔ اگر ہم بچّوں کے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایسی کتابیں ملیں گی جن میں بچّوں کو مہذب بننے کا سبق دیا گیا تھا یا جس میں کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ بعض کتابوں میں اس زمانے کے سیاسی اور سماجی مسائل بھی سمجھائے گئے ہیں۔ ان ادیبوں کی نیک نیتی پر کوئی شبہہ نہیں کیونکہ انھوں نے پورے خلوص سے بچّوں کے ادب میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ کتابیں اور وہ ادیب اپنی کتابوں کے ساتھ بھلا دیئے گئے کیونکہ ان کے خیالات کی بنیاد وقتی مسائل پر ہے۔

"پال ہازوڈ" کا کہنا ہے کہ بڑے بچپن کے اس تھوڑے عرصے کی خوشی کو بھی دبانا چاہتے ہیں جب زندگی کا بوجھ ہمارے کندھوں پر نہیں ہوتا۔ خوشیوں کے اس زمانے میں جب ہم اپنے کو صرف بناتے ہی نہیں بلکہ آئندہ زندگی کی بہترین خوشیوں کو بھی اس زمانے میں حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ اچھی کتاب کی خوبیوں کو بتاتے ہوئے کہتا ہے " وہی کتاب اچھی ہے جو فن کا حق ادا کرتی ہے۔ جو بچّے میں اُپج پیدا کرتی ہے اور علم کا راستہ بناتی ہے۔ جو پہلی ہی نظر میں خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور جو اُن کی روح میں وہ تحریک پیدا کر دیتی ہے جو آئندہ زندگی میں ہمیشہ کام آسکے اچھی کتاب

وہ ہے جو بچے کے دل میں عالمی زندگی کے لیے عزت کا جذبہ اُبھارے۔ جو کھیل کی شجاعت اور نمایاں وقار کی عزت کر سکے جو بچّے کے دل میں یہ احساس پیدا کر سکے کہ ذہن اور سوجھ بوجھ کی تربیت اس کی زندگی کا مقصد ہے" اچھی کتاب کے لیے ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس کا مقصد مفید اور قابلِ عمل ہو۔ وہ معلومات کی کتابوں کو بھی اچھا سمجھتا ہے اور خصوصاً معلومات کی وہ کتابیں جس میں دنیا کی سب سے مشکل اور اہم چیز کے متعلق معلومات ہوں یعنی "انسانی دل کی"۔ وہ کہتا ہے "آدمیوں نے ہمیشہ بچّوں کو دبایا ہے" اس کی تشریح وہ یوں کرتا ہے۔ "چھوٹی روحوں کو بگاڑنا" یعنی نہ ہضم ہونے والی اور خراب کتابوں کے لکھنے کی سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور اپنے آپ کو آسانی سے عالم اور مصلح سمجھ لینا۔ خراب چیز کو دیکر دھوکہ دینا۔ یہ ہے بچّوں کا دبانا"[1]

موضوع اور خیال کی صرف یہی اہمیت نہیں کہ ادیب کیا کہنا چاہتا ہے بلکہ اس کی اہمیت پڑھنے والوں کے لیے۔ بچّوں کی کتاب کے فیصلے بچّے کریں گے کیونکہ بچّے اس کتاب سے دھوکہ نہیں کھاتے جو ان کی فطری خواہشات، خوشی، تعجب اور حیرت کو پورا نہ کر سکے۔ کتاب کے موضوع کا ارتقاء کتاب

---

[1] بچّوں کے ادب کی خصوصیات۔ مشیر فاطمہ

کے خاکے کے ساتھ قدرتی اور یکساں طور پر ہونا چاہیئے۔ غیر متعلق واقعات کے ذریعے اوپر سے تھوپا نہ جائے بلکہ حرکات اور واقعات سے بنے، بات چیت کے ذریعہ بتائی جائے اور پھر بعد میں وہ لومڑی کی چالاک فطرت کا پتہ لگائیں گے۔ یعنی لومڑی کہانی میں طرح طرح سے اپنی چالاکی کا ثبوت دیتی ہے اور دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے یا دھوکہ خود اس کو شکست دیتا ہے۔ یعنی اس کہانی میں ابتدا۔ درمیانی حصّہ اور انتہا ہوگی اور واقعات کا تسلسل ہماری دلچسپی کو برقرار رکھے گا۔ ایک چیز دوسری چیز کی طرف لے جائے گی اور اس طرح ہم نتیجے کے انتظار میں آگے بڑھتے جائیں گے۔

کہانی میں بچّوں کو سب سے زیادہ دلچسپی واقعات سے ہوتی ہے۔ اگر کہانی کا پلاٹ اچھا نہیں ہے تو وہ کتنے ہی دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہو بچّے کی دلچسپی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ بچّوں کی بعض کہانیاں صرف خارجی ہوتی ہیں۔ اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تیز حرکات ہوتی ہیں جس سے ایک تشویش کی فضا پیدا ہوتی ہے، دلچسپی خیالی نتیجے تک برقرار رہتی ہے اور جب نتیجہ سامنے آجاتا ہے تو دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ داخلی کہانیاں ہوتی ہیں جن میں اگرچہ حرکات میں دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ کہانی کے کردار پڑھنے والے پر اپنی زندگی اور انفرادیت کا گہرا اثر

چھوڑ جاتے ہیں جو ان کے ذہنوں میں مدّتوں محفوظ رہتا ہے۔ کہانی کو بھلا دینے کے بعد بھی یہ کردار پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں مثلاً ایک بچّہ بحری ڈاکو سے ملتی جلتی چاہے جتنی کہانیاں پڑھ لے مگر جب وہ ٹریژر آئس لینڈ (Treasure Island) پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک خاص قسم کے قوی ہئیکل بحری ڈاکو کا تصوّر باقی رہتا ہے جو کہ دوسرے ڈاکوؤں سے ملتا جلتا ہے لیکن یہ سب پر حاوی ہے۔ اکثر کہانیاں ادیب کی جاندار کردار پیدا کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے ادب میں جگہ پا جاتی ہیں۔ ادیب کو جگہ اور وقت کا احساس ہوتا ہے۔ پڑھنے والا حقیقت کے دھوکے کو محسوس کرتا ہے جس میں صرف منظر نگاری کہانی میں گہرائی اور شدّت پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے اور سب سے زیادہ ادیب کا اسلوبِ بیان کہانی کو جاندار بناتا ہے۔

بچّوں کے لیے خارجی طور سے لکھنے کے علاوہ ایک طریقہ اور بھی ہے جس میں واقعات کے مقابلے میں آوازوں کو زیادہ اہمیت ہوتی ہے یعنی لکھنے والا اپنے بچپن کے بارے میں سوجھ بوجھ سے اپنے بچپن کے تصوّرات کو اُجاگر کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت اس کا رویّہ داخلی ہوتا ہے۔ وہ بچّوں سے کوئی بات کہنا چاہتا ہے اور کہانی کہنے کے انداز سے بچّوں کو لطف اندوز کرتا ہے۔

پال ہازوڈ کا کہنا ہے "بچّوں کی کتابوں میں کچھ اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے اور کچھ سچّی باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ بچّے سچّائی اور ایمانداری پر اعتقاد رکھیں۔ ادیب میں تخلیقی اور تخیّلی صلاحیت اور زبان میں اثر ہونا چاہیئے"[1]

پریوں کی کہانیوں کو ادب میں جو اہمیت اور مقبولیت ہے اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ ان کہانیوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اچھے ادب کی طرح ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ پریوں کی کہانیاں انسانی تہذیب کی بہترین یادگار رہیں۔ یہ کہانیاں دور دراز اور پسِ ماندہ علاقوں میں اپنے اصلی روپ میں محفوظ ہیں۔ ادیبوں نے اِن سُنی ہوئی کہانیوں کو لکھ کر کتابوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ محققین نے ان کہانیوں کو تلاش کرنے اور جمع کرنے میں ساری زندگی بِتا دی۔ ان کا مقصد بچّوں کے لیے بچّوں کی کہانیاں جمع کرنا نہیں تھا اور نہ ہی ان کو ان کہانیوں میں دلچسپی تھی بلکہ ان کا اصل مقصد تو ایسی کہانیوں کے ذریعہ ابتدائی زمانے کے لوگوں کے رسم و رواج، رہن سہن اور اُن کے خیالات کا پتہ لگانا تھا۔ غرض انسانی تہذیب کے ابتدائی دور کی عکّاسی کی وجہ سے بچّوں کے ادب میں ان کی بڑی اہمیت ہے اور اپنی ادبی خصوصیات کی بنا پر مقبول ہیں۔ کسی

---

[1] بچّوں کے ادب کی خصوصیات - مشیر فاطمہ

کو نہیں معلوم کہ ان کہانیوں کا لکھنے والا کون تھا۔ یہ کہانیاں ہمارے ذہنوں پر اچھی طرح نقش ہیں اور روزمرّہ کی گفتگو اور مثالوں میں ان کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اس سے بڑوں کے اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ پریوں کی کہانیاں فضول اور بے معنی ہیں۔ موجودہ زمانہ اور اس کے عقائد سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ آج کل قدرت کے اسرار کو سائنس نے بخوبی معلوم کر لیا ہے اس لیے ان کہانیوں کی ادب میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بڑوں نے یہ کہانیاں اس لیے ترک کر دی ہیں کہ اس میں بچپن زیادہ ہے۔ "علی بابا کا "کھُل جا سِم سِم"، "سونے کے انڈے دینے والی مُرغی"، "مایا داس" کے حوالے تاہم آج کی سائنس کی دنیا میں برابر ملتے ہیں۔ پریوں کی کہانیوں سے بچّے دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ عجائبات کی دنیا میں، جو اس کی اپنی دنیا سے ملتی جلتی ہے پھر بھی اس سے مختلف ہے کیونکہ یہاں ہر بات ممکن ہے اور ہوتی ہے۔

والٹر ڈی لامیر کا کہنا ہے "ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کہانی کے کردار، واقعات اور مناظر چاہے کتنے ہی حقیقی اور اصلی معلوم ہوں وہ اصل میں خیالی ہوتے ہیں۔ ایک حد تک اور ایک خاکے کے اندر وہ کافی معقول معلوم ہوتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ کہا جائے تھوڑی دیر کے لیے اسے مان لیں اور اس کا اثر بھی

قبول کرلیں یہ دونوں باتیں اس پر مبنی ہیں کہ خود ہمارے تخیّل کی قوت کتنی ہے۔ یہ کہنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں کہ فلاں فلاں بات نہیں ہوسکتی۔ کہانی میں تو یہ سب چیزیں تصوّر کی جاتی ہیں اور اسی لحاظ سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں[1]"

پریوں کے عجیب وغریب واقعات میں ایک موثر فضا ہوتی ہے۔ سیدھی سادی زبان میں یہ واقعات ایسے بیان کئے جاتے ہیں کہ بچّہ حیرت انگیز طور پر واقعہ، مزاج اور رومان کی بہترین دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ قصّے بچّوں کی صرف قوتِ تخیّل کو تسکین نہیں دیتے بلکہ کچھ اور بھی خصوصیات رکھتے ہیں۔ یہ کہانیاں صدیوں سے زبان در زبان چلی آرہی ہیں۔ ان کہانیوں میں اپنے پرانے ادب کی اکثر روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ گریم (Grimm) کی لوک کہانیوں میں جرمن قوم کا کردار، گھریلو واقعات اور تفصیلات سے اس کی دلچسپی، عملی زندگی سے اس کا گہرا لگاؤ اور اس کی جدّت پسندی پائی جاتی ہے۔ فرانسیسی Perraults کے پریوں کے قصّوں میں صاف گوئی اور واقعات کا منطقی تسلسل ہے۔ مشکلات میں مستعدی اور حاضر دماغی سے کام لینا فرانسیسیوں کی خصوصت ہے۔ جیکب (Jacob) کے پریوں کے

---

[1] بچّوں کے ادب کی خصوصیات۔ مشیر فاطمہ

قصّے میں انگریزی قوم کی عام سوجھ بوجھ اور سخت مزاجی ہے۔ کم گوئی جو ان کا مزاج ہے۔ اِن کہانیوں میں ان کی آزادی سے محبت اور انصاف پسندی کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں بھی انگریز اپنے اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کہ ہر چیز کا بہترین استعمال کرنا چاہیئے اور دشمن کے سامنے ہمیشہ اپنے کو بہتر ظاہر کرنا چاہیئے۔ پریوں کے قصّے اپنی خوبیوں اور اپنی فضا سے اس مقام کا پتہ دیتے ہیں جس علاقے سے ان کا تعلق ہے۔ قدرتی ماحول اور نسلی اثر کا فرق وہاں کے تخیّلی ادب سے معلوم ہوتا ہے۔

کہانیوں کو موثر بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس میں الفاظ اور واقعات کی تکرار ہو اور یہ مانا ہوا طریقہ اکثر و بیشتر کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ الفاظ اور واقعات کو دہرایا تو جاتا ہے لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ۔ اس طرح پہلا واقعہ یا جملہ جب دہرایا جاتا ہے تو پہلی بات کو یاد بھی دلاتا ہے اور کوئی نئی بات بھی سامنے آجاتی ہے۔ پریوں کے قصّے میں کہانی کی بناوٹ، ڈرامائی فوجی، کردار نگاری، مضمون کی سادگی، اداکاری، پُرزور مکالمات اور دوسری نمایاں خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ بچّوں کے ماہرین کو یہ جاننا ضروری ہے کہ بہترین کہانیاں جو عرصۂ دراز سے بچّوں کے ادب کا خزانہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کی مقبولیت کی کیا وجہ ہے۔

پریوں کی کہانیوں کی نئی طرز جس میں پرانی زبان کی بجائے موجودہ

بول چال کی زبان کو استعمال کیا گیا ہے اس کے ذریعہ سے بچّوں کے ذہن میں کہانی آسانی سے سمجھ میں آجانا چاہیئے۔ کہانی کی روانی اور تسلسل ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ بے معنی اور بے تکے الفاظ نہیں ہونے چاہئیں۔ پریوں کے قصّے ہماری ادبی میراث ہیں جن کا اپنا طرز اور تکنیک ہے۔ کہانی کا طرز جدید یا روایتی جو بھی ہو اس کا مقصد لوک کہانی کی خوبیوں کو بچّے تک پہنچانا ہے جس میں زندگی، خوبصورتی اور تخیّل ہو۔ پریوں کی کہانیوں کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ سیدھے سادے طریقے سے شروع ہوتی ہیں جب بہادری دکھانے کا موقعہ آتا ہے تو اس میں صرف وہی واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے کہانی کا تعلق ہو اور کہانی کا انجام جلد ہی نظر آجاتا ہے اور یہ قصّے چاہے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان سب میں چند چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ پریوں کے قصّوں کے انجام میں عام طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے مثلاً "اس کے بعد وہ ہمیشہ چین سے رہنے لگے۔ یہ جملہ ضرور سے ہوگا اور اگر نہ بھی ہو تو اس قسم کے جملے ضرور ہوں گے کہ اب کہانی ختم ہوگئی، یعنی سُننے والوں کو اب اس کے آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ پریوں کے قصّوں کی ایک اور خصوصیت تین چیزوں کا بار بار آنا ہے یعنی کہانی کا مخصوص کردار چاہے وہ لکڑہارا ہو یا لوہار ہو یا بادشاہ، اس کے تین بیٹے ہوں گے جو اپنی قسمت آزمائی کے لیے نکلتے ہیں اور ان میں چھوٹا لڑکا

چاہے وہ بے وقوف ہی کیوں نہ ہو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ تین کارنامے یا تین کام، تین عاشق، تین تحفے یا تین معمّے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی الفاظ یا جملے تک تین تین بار دُہرائے جاتے ہیں۔

بچّے کے تصوّر میں ظلم اور ہیبت کی ایک انتہائی مشکل ہوتی ہے۔ پریوں کے قصّے اس ڈر اور ہیبت کو کم کردیتے ہیں۔ اس قسم کے قصّے بار بار سُننے کے بعد بچّے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا میں اچھائی برائی پر قابو پالیتی ہے۔ سچّائی جھوٹ کو زیر کرسکتی ہے۔ کمزور ترین انسان بھی اگر وہ ہمت، دوراندیشی، اور سچّائی سے کام لے تو بڑی سے بڑی طاقت کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ یہ سبق بچّے کے لیے ضروری ہے اور آج کل کے دَور میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

والٹر ڈی لامیر نے اپنی تصنیف "جانوروں کی کہانیوں" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"یہ ضروری نہیں کہ تمام اچھی کہانیاں خوشی کی کہانیاں ہوں۔ دُکھ سے بھری ہوئی، افسوسناک اور ہیبت دلانے والی کہانی، تصویر یا نظم بھی اچھی ہوسکتی ہے۔ یہ سب دماغ کو مالامال کرتی ہیں اور خودبینی کو دعوت دیتی ہیں۔ ان کے پڑھنے سے خواہ ہمیں تکلیف یا دہشت ہو پھر بھی ہم ان کہانیوں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار، واقعات

اور مناظر ہمارے سامنے رہتے ہیں۔ ان کے خوبصورت الفاظ
اور موسیقی ہمارے ذہنوں کو روشن کرتی ہے۔

ایک چھوٹا بچّہ ہیبت ناک کہانیوں کو سُننے کے بعد سوتے وقت ڈر سکتا ہے۔ میں خود ڈرا کرتا تھا لیکن مجھے ان کو بار بار سُننے میں مزہ بھی آتا تھا۔ گو کہ ان کا بہت کچھ انحصار کہانی سُننے والے پر ہوتا ہے۔ بچپن میں ڈراؤنے دیو کی شکل اکثر سوتے وقت میرے سامنے آجاتی تھی۔ مرجینا کے ساتھ میں تیل کے ہر پیپے کے پاس جاتا تھا اور اس وقت تک اس کے ساتھ رہتا تھا جب تک چالیسوں چوروں کو مار کر ختم نہ کر دے۔

میں ان کہانیوں سے محض کہانی کا لُطف لیتا تھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان ڈراؤنے قصّوں کو سننے اور اُن سے ڈرنے کے باوجود مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

اگر بعض پریوں کے قصّوں سے رحم اور ڈر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو بعض قصّے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن سے تحیّر اور خیال آرائی، خوبصورتی اور شعریت کا ذوق بڑھتا ہے۔ مختلف قسم کی کہانیوں کے پڑھنے سے بچّے

لہ بچوں کی تعلیمی نفسیات ۔ ڈاکٹر عبدالرؤف

کے ہمدردانہ جذبات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ تعجب، حیرت، مزاح، رنج اور خوبصورتی وغیرہ، ہر چیز کو بچّہ سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ تمام چیزیں اسے اچھی کہانی میں مل جاتی ہیں۔

بعض ملکوں میں ایسی لوک کہانیاں بھی ملیں گی جن میں ادبی تخلیق کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ ایسے ملکوں کی کہانیاں جمع کرنا بڑوں کی دلچسپی کا باعث ضرور ہوں گی لیکن بچّوں کے ادب کے لیے کوئی کہانی صرف اس لیے دلچسپ نہیں ہوگی کہ وہ اس ملک کی پرانی کہانی ہے۔ بچّوں کی کہانیوں میں ادب کی خصوصیات پائی جانی چاہئیں۔ اس میں اچھی کہانی کا عمل اور ڈرامائی خصوصیات ہونی چاہئیں۔ جب ہی اس کو بچّوں کی مقبول کہانیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جن کہانیوں میں دوامی تازگی اور تخیّل کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں بچّے انہیں کہانیوں کو بار بار سُننا چاہتے ہیں۔

داستانیں

کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مشغلے سے اس کا لگاؤ اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جیسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ انسان اپنی

حیاتِ اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی جن قوتوں سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار تھا اُس پیکار اور کش مکش میں اسے سختی کی جن منزلوں سے گزر کر فتح و ظفر کا روئے تاباں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوتی تھی اس کی روداد میں اس کے لیے قند مکرّر کی چاشنی تھی۔ کام و دہن کو اس چاشنی سے آشنا کرنے کی خواہش نے اسے آپ بیتی دہرانے کا عادی بنایا۔ یہی کہانی کہنے کی یا داستان سرائی کا آغاز ہے۔ تھکے مارے انسان کو اپنے سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لیے فطرتاً کسی ایسے مشغلے کی تلاش تھی جو اس کے فطری احساسِ برتری کو بھی تسکین دے سکے اور اس پر عارضی طور پر ایسی خود فراموشی بھی طاری کر سکے کہ اس ماحول میں حقائق کی سچّائی اور تلخیاں اسے نہ ستائیں تو لوگ اپنی بہادری کے کارنامے بیان کرتے، کہانیاں کہتے، پریوں کی داستانیں وغیرہ بیان کرتے، اپنی محبت کا اظہار کرتے، اپنی ان کش مکشوں کو دہراتے اور رومان کی لذّتوں میں گم ہونے کے علاوہ اس مشغلے میں ایک اور بڑی بات یہ تھی کہ ساری کہانیاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آنے کا وسیلہ بھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی وہ زندگی جس کا پس منظر کوہ و بیابان کی سنگینیاں اور پنہائیاں ہیں اس کی داستان سرائیوں سے گونج رہی ہے۔ کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے۔ کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی

کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے۔ کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور، تخیّل تصوّر اور رومان کے ایک جہانِ تازہ کی تصویر ہے۔ کہانی کا یہی تصوّر ہماری داستانوں کا بنیادی تصوّر ہے۔ داستانوں میں دلچسپی پیدا کرنے اور قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ایک وسیلہ یہ بھی ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا سے الگ پڑھنے کے لیے رومان کا ایک جہانِ دلکش آباد کرتا ہے۔ اس دنیا میں ان لوگوں کی کثرت و فراوانی ہے جنھیں خُدا نے تاجداری و جہانبانی کا شرف بخشا ہے۔ بادشاہ، وزیر، تاجر اس دنیا کی رونق اور آبادی ہے۔ اس رونق کی شان و شوکت، شانِ جمال و جلال ہی قاری کے لیے وہ کشش ہے جس سے وہ اپنی سیدھی سادی حقیقت کی دنیا سے محروم رہتا ہے۔ اس رنگین، حسین و جمیل اور پُرشکوہ دنیا کی تشکیل و تعمیر داستان گو کے فن کی روایت کا حصّہ ہے اور اپنی روایت کی اس دلکشی سے وہ قاری کے دل کو موہ لیتا ہے۔

بادشاہوں، وزیروں، امیروں کی اس دنیا پر پریوں کا سایہ بھی ہے۔ پریاں، جِن، دیو، ساحر اور نجومی رومان کی اس عجیب و غریب دنیا کے باسیوں کے مسّرت و غم میں ان کے شریک ہیں اور پڑھنے والے کو اس دنیا میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہیں۔

ان غیر معمولی اور مافوق الفطرت باتوں کو عقل کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی، اس لیے انسانی تجربے اور مشاہدے کے لیے یہ سب کچھ انوکھا اور نرالا ہے۔ لیکن داستان گو کا دائرۂ عمل دنیائے حقائق کی بجائے عالم تخیّل و تصوّر ہے۔ اس لیے داستان کا قاری اسی دنیا کی سیر سے مطمئن اور مسرور رہے اور یوں داستان گو کے اس فنی منصب کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ وہ قاری کے لیے سرور و انبساط کا سرمایہ مہیّا کرے۔ بچّوں کو داستانیں سناتے وقت داستان گو کو چاہئے کہ وہ بچّوں کے لیے ان داستانوں میں جان اور دلچسپی پیدا کرے۔ بچّوں کو داستان سناتے یا لکھتے وقت ایسی مثالیں دینی چاہئیں کہ، وہ بدی جو اسے زندگی میں ہمیشہ سختیوں اور آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے جہاں نیکی سے متصادم ہوتی ہے تو شکست کھاتی ہے۔ تخیّل اور تصوّر کی اس دنیا کے باشندے یوں دیکھنے میں ہماری دنیا کے انسانوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن اپنے غیر معمولی عمل اور قوتوں کی بناء پر ان کی سیرت اور شخصیت مثالی بن جاتی ہے۔ جو نیک ہے وہ نیکیوں کی ان سب خصوصیات کا حامل ہے جو انسان کے تصوّر میں آسکتی ہیں۔ جو بد ہے وہ بدی کا ایسا مجسمہ ہے کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ جرأت، ہمّت، شجاعت اور مردانگی کی بجائے ابدی سکون اور راحت کا انعام ہے۔ مروّت، محبت

اور دردمندی کے بدلے جاہ و ثروت ہے۔ عارضی سخت کوشی کے بدلے دائمی راحت ہے۔ باطل پر حق کی فتح ہے۔

دیومالا

دیومالا کو ہم ان داستانوں میں شمار کرتے ہیں جب آدمی انسانی تہذیب کے بچپن میں قدرت کے اسرار و قوانین کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس نے مختلف دیوؤں کا سہارا لیا۔ قدیم ترین انسانی تہذیب کے گہوارے مصر و یونان، چین اور ہندوستان میں قدرت کے ہر کام کے لیے ایک دیوتا ہوتا تھا۔ قدرت کے قوانین انسان کی دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے قدیم لوگ قدرت کے کارخانے کو عام آدمیوں کی بستی ہی سمجھنے لگے تھے۔ جب یہ قصّے لکھے گئے تو یونانی دیومالائیں دلکش بھی تھیں اور ان میں تخیّل کی پرواز بھی زیادہ تھی۔ ان یونانی داستانوں کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی اور چینی دیومالائیں بھی موجود ہیں جن کی اپنی ادبی حیثیت ہے۔ بچوں کے لیے جب یہ کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جوں کی توں لکھ دی جائیں ادیب کی تخلیقی صلاحیت کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی

ضرورت ہے کہ اگر کہانی کی اصل روح باقی نہیں رہی تو کہانی بے مزہ ہوجاتی ہے، وہ محض واقعہ نگاری ہوجاتی ہے۔ بچّوں کی کہانیاں لکھنے والے کہانیوں میں جان اور دلچسپی اس وقت پیدا کر سکتے ہیں جب کہ انھوں نے ان قصّوں اور کہانیوں کو بار بار دلچسپی سے پڑھا ہو اور ان سے لطف اندوز ہوئے ہوں۔ ادیب کہانی کو صرف اس وقت لکھنے کا حق ادا کر سکتا ہے جب وہ کہانی کے ماحول اور حالات سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ ہر ملک کی داستانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں میں جو زندگی اور نظریئے ملتے ہیں ان کی ایک قومی حیثیت ہوتی ہے ان میں اس ملک کے قومی ادب کی جھلک پائی جاتی ہے۔

بچّوں کے ادب کو اب بھی ہم دوسرے درجے کا ادب تصوّر کرتے ہیں اس لیے بہ نسبت دوسرے ممالک کے ہم اپنی ہندوستانی دیو مالاؤں کو بچّوں تک نہیں پہنچا سکے۔ کرشن جی، شکنتلا، کورو پانڈو اور رامائن کے قصّوں کو ہم نے بچوں تک پہنچانے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس کی روح کو اور اس کی ادبی خوبیوں کو ہم اس کا جُز نہ بنا سکے۔

رزمیہ داستانیں ۔ سورماؤں کے قصّے روایتی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ یہ قصّے ہر دَور اور ہر تہذیب میں سنے اور سنائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن ان کو رزمیہ نظم کی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب کوئی

بڑا شاعر اس سے متاثر ہوا۔ کالی داس اور فردوسی کا کمال تھا کہ انھوں نے شکنتلا اور شاہنامے کے ذریعے ہم کو اس دَور کی تہذیبی عظمت سے آشنا کیا۔ رزمیہ داستانوں کو جب بچّوں کے لیے لکھا جائے تو اس کے اسٹائل اور مواد کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ساتھ ہی رزمیہ نظم کی پوری روایت، حُسن اور تخیّل کے پرواز کو برقرار رکھنا چاہیئے۔

روایتی داستانیں۔ داستان کا مطلب ہے کسی واقعہ کا بیان کرنا اور لکھنا۔ شروع شروع میں قصّے زبانی سنائے جاتے تھے۔ عام طور پر سرائے میں دیس بدیس کے مسافر اکٹھّا ہوتے تو وہ اپنی پچھلی زندگی اور سیر و تفریح کے حالات سے ایک دوسرے کو باخبر کرتے۔ سردیوں کی لمبی لمبی راتوں میں الاؤ کے چاروں طرف بیٹھ کر لوگ جگ بیتی سنتے اور آپ بیتی سناتے تھے۔ پڑھتی ہوئی عمر کے بچے بڑوں کے ساتھ الاؤ کے اردگرد بیٹھ کر کہانیاں سُنتے تھے اور چھوٹے بچّے دادی اور نانی کی گود میں چولہے کے پاس یا بستر میں دبک کر ان قصّوں کو سنا کرتے تھے۔ یہ قصّے پریوں اور دیوتاؤں کے نہیں بلکہ عام لوگوں سے متعلق ہوتے تھے۔ ان کی بہادری، وفاداری کے کارنامے، ان کی محبت اور نفرت کی داستانیں، نیکوں کی نیک دلی اور بُروں کی بدی کے تذکرے وغیرہ۔ ان میں وہی کردار ہوتے ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ صرف خاص کردار کو مخصوص حالات میں

دکھایا جاتا ہے جس میں ہیرو اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا ہے، کسی مظلوم کو مصیبت سے نجات دلاتا ہے چاہے اس کو خود اپنی جان گنوانی پڑے۔ ان کہانیوں میں بچّوں کو ہیرو کی غیر معمولی بہادری سے دلچسپی ہوتی ہے اور ان مخصوص حالات میں وہ ہیرو کے ساتھ خود بھی اپنے آپ کو بہادر اور نڈر تصوّر کرتے ہیں اور اپنی قوتِ تخیّل کو پرواز کا مواقع دیتے ہیں اس طرح وہ اپنے تجربے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہادروں کے قصّے اس دور کی عکّاسی اور اس دَور کے لوگوں کی ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس زمانے کے رسم و رواج اور طور طریقوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کہانیوں کی دلکشی کی وجہ صرف ان کی جان جوکھم کے کام میں نہیں بلکہ ان میں اندرونی سچّائی پائی جاتی ہے جو ان کو دوسری بہادری کی کہانیوں سے بالاتر بنا دیتی ہے زندگی کے لیے ایک اہمیت ہے جو ان کہانیوں میں نہیں ہوتی جن کے کردار اور واقعات بچّے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ کسی دوسری قسم کی یہ کتابیں بچّے کے تخیّل، تجربہ اور اطمینان نہیں دے سکتیں۔

پریوں کے قصّوں میں بھی ایک تخیّلی حقیقت ہوتی ہے اور اگر بچّے نے پہلے پریوں کے قصّے نہیں سُنے یا نہیں پڑھے ہیں تو ان کو روایتی داستانوں میں کم لطف آئے گا۔ روایتی روپ کی دونوں قسموں میں

ایک فرق ہوتا ہے۔ پریوں کے قصوں میں ہیرو کی جیت یقینی ہوتی ہے۔ داستانوں میں بہادر ہیرو ایک اچھا آدمی ہے لیکن مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے یا وہ آخر میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ مگر بچّوں کے لیے فتح و کامرانی کی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ہیرو کس ہمت و جوانمردی سے مقابلہ کرتا ہے صرف وہی بات اہمیت رکھتی ہے۔ روایتی داستانوں کو پڑھنے سے بچّوں کو خاص تجربہ حاصل ہوتا ہے ان قصّوں میں بہادری کے، جادو اور رومان کے فریب کے علاوہ زندگی کے حقائق اور صداقتیں بھی ہوتی ہیں۔ بہادروں کے کارناموں میں ان کو بہادری کے ایسے واقعات ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر وہ مبہوت ہو جاتے ہیں لیکن روایتی داستانوں میں بہادری کے کارناموں کے ساتھ ہیرو کی مصیبت اور جدوجہد کے واقعات بھی سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے بچّے کو ہیرو سے ہمدردی اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بچّہ ایک بہادر کے کردار اور اس کی بہادری کے کارناموں اور اس کی مصیبت کے حالات پڑھ لیتا ہے تو اس کو زندگی کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی آرام، آسائش اور کامیابی ہی کی زندگی نہیں ہے بلکہ خندہ پیشانی اور ہمت کے ساتھ مصیبت کا مقابلہ کرنے کا نام زندگی ہے۔ اس طرح بچّے میں صبر و تحمّل، ہمت اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ عملی زندگی کی راہ میں ایک قدم

آگے بڑھاتا ہے۔ ادبی اور تہذیبی سرمائے میں بچّوں کو ایسے قصّے سنائیں جو ان کے دل و دماغ کو روشن کر دیں، جو ان میں اچھے کام کرنے کی لگن پیدا کر دیں، جو اس میں صبر و تحمّل کے جذبے کو اُبھاریں اور مصیبت میں بہادری اور ایمانداری سے کام کرنے کی طرف مائل کر سکیں۔

شاعری

شاعری سے لُطف اندوز ہونے کی صلاحیت کسی مخصوص طبقے کی میراث نہیں ہے۔ اس سے عوام بھی اسی طرح لُطف اندوز ہوتے ہیں جیسے خواص۔ یہ انسانیت کی میراث ہے بچّے میں بھی شاعری سے لُطف اندوز ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ چھوٹا بچّہ بھی تال و سُر اور تکرار سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بچپن کے اس قدرتی شوق کو پورا کرنے کے لیے بچّوں کو اچھے گیتوں اور نظموں سے مانوس کرائیں تاکہ وہ بڑے ہو کر شاعری سے محظوظ ہو سکیں۔

بچّوں پر شاعری کے اثرات بڑے دور رس اور مختلف ہوتے ہیں۔ رزمیہ شاعری ان میں جوش پیدا کرتی ہے۔ شعر کی غنّائیت ان کے کارناموں کو موسیقی سے آشنا کرتی ہے۔ نظم کی اکثر منظر نگاری پر مبنی کہانیاں بچّے

کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ بدقسمتی اور اُداسی کی جذباتی نظمیں، طربیہ گیت کے مصرعے جن کا ہر لفظ نگینہ کی طرح چمکتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جنھیں بچّے پہچانتے اور ان سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لیے بچّوں کے ادب میں محض چھوٹے گیت اور آسان نظمیں ہی شامل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ شاعری کے معاملے میں بچّے کا تخیّل، اس کی سمجھ بوجھ سے اونچا اُڑ سکتا ہے، اس کے جذبات اس کے چھوٹے سے ذہن میں بہت آگے جا سکتے ہیں شاعری سے ان کو بس ایک سبق سیکھنا ہے اور وہ سبق ہے خوشی کا۔

بعض بچّے اپنے طور پر تلاش اور تحقیق کرتے ہیں وہ فطری طور پر شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اپنا راستہ تو جانتے ہیں لیکن اس کے لیے مشعل تلاش کرتے ہیں تاکہ اپنی زندگی کے راستے پر کامیابی سے گامزن ہو سکیں۔ کہانی اور نظم دونوں ہی میں الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن ادیب اور شاعر دونوں ہی الفاظ کا استعمال مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ جو بچّے روزمرّہ کی زبان سے بخوبی واقف ہیں وہ کہانی کے ان جملوں کو سمجھ سکتے ہیں "کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا" اور "پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے"، "جیسے ان کے دن پھرے خدا سب کے دن ویسے ہی پھیرے" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب بچّہ نظم سُنتا ہے تب وہ الفاظ کی نئی ترتیب سے

مانوس ضرور ہوتا ہے۔ الفاظ کی یہ نئی ترتیب جو کہانی سے مختلف ہوتی ہے اس کو زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بچّہ نظم کے الفاظ کے مقابلے میں ترنّم سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ نظم کو پڑھنے کے لیے ترنّم کے ساتھ ساتھ انداز بھی ہونا ضروری ہے۔ جن لوگوں نے ترنّم کے ساتھ بچّوں کو نظمیں سُنائی ہیں وہ جانتے ہیں کہ نظم سُن کر بچّوں کی آنکھوں میں کیسی چمک پیدا ہوتی ہے اور بچّہ نظم سے کتنا متاثر ہوتا ہے۔ ادب کی دوسری اصناف کے برخلاف شاعری بچّوں اور بڑوں دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے لیکن بچپن کی مدّت تھوڑی ہوتی ہے اس لیے اس کو احساس کے دوسرے دور میں بہترین شعری ادب سے روشناس کرا دینا چاہیئے۔

موت کا موضوع بچّوں میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ اگرچہ بچّوں کے لیے بہت سی نظمیں ماں، باپ، بھائی، بہن اور پالتو جانوروں کی موت پر کہی گئی ہیں۔ مرثیے کو بچّوں کی نظم میں شامل کرنا مناسب نہیں۔ ان کے لیے تو ایسی نظمیں ہوں جن میں خوشی اور زندگی کے گیت ہوں۔ نظم میں صرف تُک بندی ہی نہ ہو بلکہ اس میں تخلیقی چنگاریاں ضرور ہوں۔ بچّوں کی نظموں کے مصرعے میں بیانیہ نظمیں، تمثیلی ڈرامے، غنائیہ نظمیں شامل کرنا چاہئیں بیانیہ نظمیں بہت طویل نہ ہوں اور نہ ان میں فلسفے اور سیاست کی باتیں ہوں جو اُن کے تجربے اور سمجھ سے باہر ہوں۔ تاریخی نظموں سے بچّے بہت متاثر ہوتے

ہیں۔ بچّے کا حساس ذہن اور جذبات ایسی نظمیں پسند کرتے ہیں جو ان کے تخیّل میں قوتِ پرواز پیدا کر سکیں اور ان کو متاثر کر سکیں۔ ان میں خوشی اور تعجب کے جذبات پیدا کر سکیں۔ اس عمر میں ہمیں اپنے ادب کے بہترین نمونوں سے بچّوں کو آشنا کرنا چاہیئے۔ نظیر اکبرآبادی، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، اقبال، چکبست، بے نظیر، افسر، نیر وغیرہ کی نظمیں بچّوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کے ذہنوں کو اُجاگر کرتی ہیں۔ ہمیں بچّوں کی نظموں میں صرف ان تُک بندیوں پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ جن کے کوئی معنٰی نہیں ہوتے جو بچّے کے تخیّل کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔

بچّوں کی نظمیں ایسی ہوں کہ ان کے ذہن، دل اور تخیّل کو تعجب، حیرت اور حُسن سے متاثر کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ آسان نظمیں لکھیں جائیں بلکہ ہمیں بچّے کی اس صلاحیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ خوبصورتی اور عجائبات سے متاثر ہو کر ان کے متعلق جس قدر کہہ سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ اپنے تخیّل اور وجدان کے ذریعہ سمجھ سکتا ہے۔ نظم پڑھتے وقت وہ اپنی زبان کے علم سے ہی کام نہیں لیتا بلکہ ان خیالات اور احساسات سے بھی کام لیتا ہے جس کا خود اسے علم نہیں۔ اگر ہم زیادہ سے زیادہ بچّوں میں شاعری کا ذوق پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ بچوں کے لیے ایسی نظموں کا انتخاب کریں جن سے بچے زیادہ اچھی طرح لُطف اندوز ہو سکیں۔

کہانیاں

بچّے کہانی سے لُطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں کہانی پڑھنے میں مزہ نہ آئے تو وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ ایک بچّہ کسی ایک کہانی سے زیادہ اور دوسری سے کم لُطف اندوز ہوتا ہے۔ بچّے بھی بڑوں کی طرح کسی کہانی سے ذاتی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے سب بچّے پسند کرتے ہوں۔ لیکن کچھ کہانیاں ایسی ضرور ہیں ہیں جو تمام بچّوں کو پڑھنے کے لیے دی جانی چاہئیں جنھیں پسند کرنے کا تمام بچّوں کو موقع ملنا چاہیئے۔ ان کتابوں سے بچّوں کو ایسا تجربہ حاصل ہوتا ہے جو بے پناہ خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اس تجربہ کو حاصل کرنے کے لیے بچّے اس کتاب کو بار بار پڑھتے رہتے ہیں۔ بچّے کا متحرک اور وسیع ذہن صرف ایک اچھی کتاب ہی کے ذریعے اپنے تجربات کو بڑھا سکتا ہے۔ معمولی قسم کی کہانیوں کے معاملے میں ان کا فیصلہ صحیح نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی قوتِ تخیّل، توجہ اور قیاس آرائی کو اس طرح بروئے کار لاتے ہیں کہ ایک معمولی کتاب بھی ان کو اچھی لگنے لگتی ہے۔ بچّوں کو ایسی کہانیاں اچھی لگتی ہیں جن میں حادثہ ہو۔ مبالغہ ہو۔ ایسے حادثات اور واقعات جو سچّے

بھی ہو سکتے ہیں۔ کپلنگ کا کہنا ہے "افسانہ حقیقت کی بڑی بہن ہے"[1] ظاہر ہے جب تک کسی نے افسانہ نہیں لکھا لوگوں کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ حقیقت کیا شے ہے۔ کہانی میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ خیالی ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ واقعات ہماری روزمرّہ زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں یا آ سکتے ہیں۔ اس طرح کہانی کسی حد تک سچّی ہوتی ہے اس قسم کے واقعات پڑھ کر بچّوں کو جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ خود اس میں دلچسپی پیدا کرتا ہے اور ان کے لیے خیال آرائی کا موقع فراہم کرتا ہے۔

بحری سفر کے قصّوں سے بچّوں کو بڑی دلچسپی ہے کیونکہ سمندر ان کو ایک نامعلوم دنیا میں لے جاتا ہے جس کی بے پناہ طاقت سے وہ مرعوب ہوتے ہیں، جس کی گہرائیوں کے متعلق وہ جاننا چاہتے ہیں۔ جہاز میں بیٹھ جانے کا منظر ان کو ڈرا تو ضرور دیتا ہے لیکن وہ سندباد جہازی کی مستعدی، جرأت اور ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔

تاریخی کہانیاں۔ پُرانے زمانے کے حالات اور واقعات رسم و رواج اور رہن سہن کے متعلق عجیب و غریب باتیں سُن کر بچّوں کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ان تاریخی قصّوں کو بڑے شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔

---

[1] ماہنامہ "آج کل"

تاریخی کہانی میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو داستان جسے لکھنے والا بیان کرنا چاہتا ہے، دوسرے تاریخ کا تانا بانا۔ فنکار اپنی کہانی کو کسی مخصوص دور سے وابستہ کرتا ہے اس کی خاطر وہ اپنے تصوّرات کو اس دور میں لے جاتا ہے۔ فنکار اپنے آپ کو ایک خاص تاریخی دور سے وابستہ کرتا ہے تو تصوّرات کی دنیا میں اس زمانے کے حالات کو بساتا ہے اور پھر کہانی کا روپ دیتا ہے۔ وہ کہانی کے حسن کو برقرار رکھتا ہے مگر تاریخی واقعات کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کہانی کو ایک مخصوص تاریخی پس منظر میں لکھنا ہوتا ہے جس میں اس زمانے کے حالات، واقعات اور رسم ورواج کی عکّاسی ہوتی ہے اور اس بات کا احساس دلانا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی مگر انسان کے تجربات ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں۔ تاریخی کہانیوں میں ہمیں اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کی جھلک ملتی ہے اور اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ان مخصوص حالات اور واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے اسباب کیا تھے، اس دور کے سیاسی حالات کیا تھے، لوگوں کے مذہبی عقائد کیا تھے وغیرہ۔ بعض اچھے تاریخی افسانے اور ناول اس زمانے کی تاریخ کی بہت خوبصورتی سے عکّاسی کرتے ہیں۔

بچّوں کی تاریخی کہانیوں میں کارنامے کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

کہانی میں حرکت ہونی چاہئے ۔ اس میں جتنے زیادہ واقعات ہوں گے بچّے اُسے اتنی ہی دلچسپی سے پڑھیں گے ۔ بچّے اس سے خوش بھی نہیں ہوتے کہ تاریخی کہانی میں صرف تاریخی واقعات ہوں ۔ داستان اور تاریخ کی ایسی آمیزش ہونی چاہئے کہ وہ قصّے کا ایک جُز بن جائیں ۔ لکھنے والے کے لیے کہانی مقدم اور تاریخ موخر ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے بچّوں کو اس زمانے کی حیثیت سے آگاہ کرتا ہے ۔کسی حکومت کے عروج وزوال میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اہمیت رکھتی ہیں ۔ لوگوں کے آپس کے تعلقات ، بادشاہوں کے خاندانی حالات ، امراء اور وزراء کی طاقت حاصل کرنے کے لیے تگ و دو ، یہ سب چیزیں اس کہانی میں مضمر ہوتی ہیں اور بچّے کو اس تاریخی زمانے سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہیں ۔ اس کے مطالعے کے بعد بچّے کے لیے تاریخ صرف جنگ اور تاجپوشی کے جشن کا ریکارڈ نہیں رہ جاتی بلکہ اس زمانے کے حالات معلوم کرنے کا ایک دلچسپ ذریعہ بن جاتی ہے ۔تاریخی کہانی لکھنے والوں کے سامنے یہ بھی مسئلہ ہے کہ وہ تاریخ کے کسی واقعے کو بیان کرنے میں اس کے تاریخی ماحول کو برقرار رکھیں یا واقعات کو اس طرح پیش کریں کہ کہانی زوردار معلوم ہو ۔کسی کہانی کو بچّوں کے لیے جاندار بنانے کے لیے ان واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا صحیح نہیں۔

کسی تاریخی کہانی کا اصل مقصد تو پڑھنے والے کو اس تاریخی ماحول سے روشناس کرانا ہے۔ بچّوں کے لیے تاریخی کہانی لکھتے وقت ذہن میں تاریخی کہانی کی خصوصیت کا کوئی معیار طے کر لینا چاہیئے۔ کہانی کو دلچسپ انداز میں بیان کرنے کے لیے اس کے تاریخی پس منظر کو پھیلا دیا جائے نیز تاریخی واقعات کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہونے پائے۔ جب کہانی نگار درباری شان و شوکت اور شاہی لباس کی تفصیلات میں بھٹک کر تاریخی واقعات کو کہانی میں ٹھونستا ہے تو کہانی اس زمانے کے سماجی اور سیاسی حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی۔

سر والٹر اسکاٹ کا کہنا ہے:

"تاریخی کہانیوں میں اس زمانے کی مخصوص قدروں کو برقرار رکھنا چاہیئے مگر شان و شکوہ کی تفصیل کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔ فرسودہ الفاظ کے استعمال کے بغیر تاریخی ماحول پیدا کرنا چاہیئے۔ طاقت کا ظاہر کرنا ضروری ہے لیکن جذبات کی بیجا نمائش سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ تفصیل کو قربان کیے بغیر بھی توازن برقرار رکھنا چاہیئے۔ انسانی کرداروں پر پس منظر پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیئے۔"[1]

---

[1] بچّوں کے ادب کی خصوصیات۔ مشیر فاطمہ

تاریخی کہانیوں میں افسانے اور تاریخ کا حسین تناسب ہوتا ہے جس سے واقعات اور زمانے کا علم ہو سکے۔ جس کہانی کی بنیادیں حقیقی واقعات پر مبنی ہوں اس کو بچّہ شوق اور دلچسپی سے سُنتا اور پڑھتا ہے۔ کہانی نگار کو چاہیئے کہ بچّے میں کہانی کے ہیرو اور اس تاریخی زمانے سے دلچسپی اور ہمدردی پیدا کرے تاکہ اس زمانے سے مانوس ہو کر اس ماحول میں اپنے آپ کو کہانی نگار کے ساتھ ساتھ پائے اور اس کے واقعات سے لطف اندوز ہو سکے۔

ہر بچّہ سماج کا ایک فرد ہے۔ چھوٹا بچّہ بھی نظم کے ترنّم سے محظوظ ہوتا ہے، لوریاں سُن کر خوش ہوتا ہے۔ یہ خوشی اس کو اس وقت سے حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ الفاظ کو سمجھ یا بول نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ الفاظ پڑھنے سے پہلے تصویروں سے محظوظ ہوتا ہے۔ بچّہ جب پڑھ نہیں سکتا تو نظم کے ترنّم اور کہانی کو سُن کر خوش ہوتا ہے پھر وہ باتصویر کتابوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہ بڑوں کی طرح تصویر کی شکل، رنگ اور خط وغیرہ سے محظوظ نہیں ہوتا بلکہ تصویر میں وہ اس حقیقت کو ڈھونڈھتا ہے جس کی وہ تصویر ہے۔ تصویر بچّہ کو کتاب سے مانوس کراتی ہے۔ باتصویر کتابوں کے ذریعے ہم بچّے کی دلچسپیوں کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اگر تصویر میں کوئی کہانی بیان کی گئی ہے تو بچّہ خود بخود اس کو واضح طور

پر سمجھ لیتا ہے کیونکہ بچّہ کے لیے تصویر خود ہی کہانی کہہ رہی ہے۔ اس کے لیے پڑھنا آج ضروری نہیں ہے۔ کوئی باتصویر کتاب بچّے کے لیے اس وقت دلچسپ ہوگی جب اس کے خیالات اور احساسات بچّے کے لیے ہوں نہ کہ بڑوں کی چیز کو سہل بناکر پیش کر دیا جائے۔ باتصویر کتاب میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ الفاظ اور رنگ وخط۔ کتاب کے الفاظ اور تصویر، دونوں یکساں اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ الفاظ اور تصویر دونوں کی آمیزش سے کتاب بنتی ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کالی اور سفید تصویروں کو بچّے پسند نہیں کرتے بلکہ بنیادی رنگوں کی تصویروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اصل میں بچّے ان تصویروں کو پسند کرتے ہیں جس میں کہانی بیان کی گئی ہو چاہے وہ کالی اور سفید ہوں یا رنگین۔ بچّے باتصویر کتاب میں واقعہ تلاش کرتے ہیں۔ ایسی کہانی جس کی تصویر کو اپنا سکیں۔ جس کے ہیرو کی جگہ وہ خود کو محسوس کرسکیں چاہے وہ کتّا، خرگوش، کھلونا، ریل اور خود ان جیسا لڑکا ہو۔ کہانی میں جس تجربہ کو بیان کیا گیا ہو وہ آسان ہو اور بچّے کی سمجھ کے دائرے کے اندر ہو۔ بچّہ دن بہ دن عقل منداور سمجھدار ہوتا جاتا ہے اس لیے مصوّری اور فن کی جانچ بھی ضروری ہے۔ باتصویر کتابوں میں کہانی کو زیادہ بامعنی بنا دینا ہی مصوّر کی صلاحیت ہے جو بغیر

تصویر کی کتاب میں ناممکن ہے۔ تصویر اگر اچھی ہے تو وہ غیر شعوری طور پر فن مصوّری سے لطف اندوز ہوگا اور مصوّری کا ذوق پیدا ہو جانے کے بعد اچھی اور بُری تصویر میں تمیز کر سکے گا۔ مصوّری کی جو خوبیاں بڑوں کو متاثر کرتی ہیں ضروری نہیں کہ بچّوں کو بھی متاثر کریں۔

بچّے بہر حال ماحول سے سیکھتے ہیں۔ ان کی نقل کی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ مقصد کو دیکھتے ہیں ذرائع کی پرواہ نہیں کرتے، بلکہ خیال آفرینی کی بدولت سب کچھ مان لیتے ہیں۔ بچّوں کی کہانیوں میں سچّائی، آزادی کی لگن، قربانی، انصاف، خوشی کا درس دیا جائے۔ وہ ادب جو جھوٹ، ناانصافی، خودغرضی، لالچ اور فرقہ پرستی پر مبنی ہوگا بچّوں کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بچّوں کے لیے جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں معلّمانہ بصیرت کے ساتھ اچھے اخلاق اور نیک اطوار کی تعلیم دی ہے۔ ان کی کچھ کہانیوں کے اقتباسات ذیل میں پیش ہیں۔

ذاکر صاحب کی کہانی "ابّو خاں کی بکری" میں آزادی کی سچّی لگن اور قربانی کا درس ملتا ہے۔ انھوں نے کہانی میں جو کچھ لکھا ہے بہترین انداز میں لکھا ہے۔

"الموڑے میں ایک بڑے میاں رہتے تھے، ان کا نام ابّو خاں

تھا۔ انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے تھے۔ ابو خاں غریب تھے اور بڑے بدنصیب تھے۔ ان کی ساری بکریاں کبھی نہ کبھی رسّی تڑا کر رات کو بھاگ جاتی تھیں۔ یہ بکریاں بھاگ کر پہاڑ پر چلی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بھیڑیا رہتا تھا وہ انھیں کھا جاتا تھا۔ ایک دن ابو خاں کہیں سے ایک بکری مول لے آئے۔ یہ بکری ابھی بچّہ ہی تھی۔ ابو خاں نے سوچا کہ کم عمر بکری لوں گا تو شائد پل جائے۔ اس کا نام چاندنی رکھا تھا۔ لیکن ایک دن چاندنی بھی نکل بھاگی۔ پہاڑ پر پہنچی تو بھیڑیے کا سامنا ہوگیا۔ چاندنی نے بھیڑیئے کے آگے سر نہیں جھکایا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیئے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرے۔ جیت ہار پر اپنا قابو نہیں، وہ اللہ کے ہاتھ ہے مقابلہ ضروری ہے"۔ چاندنی رات بھر بھیڑیئے کا مقابلہ کرتی رہی لیکن صبح ہوتے ہوتے چاندنی بے دم زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سُرخ ہوگیا۔ بھیڑیئے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا۔"

پھر سادگی اور پرکاری سے فلسفۂ حرّیت سمجھا دیا ہے:

"اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں ان میں بحث ہو رہی تھی کہ جیت کس کی ہوئی - سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا - ایک بوڑھی چڑیا ہے وہ مُصر ہے کہ چاندنی جیتی"

ذاکر صاحب کی ایک اور کہانی "عقاب" بھی جذبۂ آزادی کو اُبھارتی ہے - ان کی کہانی "اندھا گھوڑا" قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے - اس کے چند جملے ذیل میں درج ہیں:

"اب سنو! اسی شہر عادل آباد میں ایک بڑی مسجد تھی اور ایک بڑا مندر - ان میں نیک مسلمان اور ہندو آکر اپنے اپنے طریقے سے اللہ میاں کا نام لیتے اور اس کو یاد کرتے تھے - گھنٹے کے بجتے ہی شہر کے اچھے اچھے مسلمان، ہندو وہاں آجاتے"

بچّوں کے اندر تعصب کا بیج ایسے موضوعات اور مضامین ہی بوتے ہیں جو یک طرفہ ہوتے ہیں اور جانبداری لیے ہوئے ہوتے ہیں - ذاکر صاحب کی ایک اور کہانی "آؤ گھر گھر کھیلیں" کئی بچّے مل کر کھیلتے ہیں - ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی - وہ ایک ہی گھر میں کھیلتے ہیں ایک ہی کھیل کھیلتے ہیں - ان سب بچّوں کے نزدیک خواہ ہندو ہوں یا مسلمان

گھر کا ایک ہی تصوّر ہے۔ ایسی کہانیوں سے بچّوں کو آپس کے میل مِلاپ کی دعوت ملتی ہے۔ بچّوں کی زندگی میں حفظانِ صحت کی تعلیم بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ "سعیدہ کی امّاں" ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں کھلی ہوا کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ "منّی کی بیماری" میں حفاظتی تدابیر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ "اسی سے ٹھنڈ اسی سے گرم" میں سائنس کی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ کہانی "مرغی کا نرالا بچّہ" سے بادنُما کے بارے میں جاننے کی خواہش اُجاگر ہوتی ہے۔ کہانی "سچّی محبت" میں لالچ کی خرابیاں دکھائی گئی ہیں۔ "جولاہا اور بنیا" میں نیکی کا فائدہ اور لالچ کا نقصان دکھلایا گیا ہے۔ کہانی "آخری قدم" میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ نام ونمود سے بے نیاز ہوکر کام کرنا چاہیئے۔ کہانی "ماں" میں مامتا کو اس طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کے پڑھنے والوں میں ماں کے مرتبے اور اولاد کی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ "بے کاری" میں غریبوں کی زندگی کا حال بتایا ہے جس سے بچّوں کے دل میں غریبوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ "مرغی اجمیر چلی" میں اہلِ غرض کی باتوں پر کان دھرنے کے بُرے نتائج پیش کیے ہیں۔ "چھدو" اور "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی" جیسی کہانیوں سے بچّوں میں جرأت آزمائی کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں بچّوں کی آئندہ زندگی

کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں ۔یہی بچّے آئندہ چل کر قوم کے معمار بنتے ہیں عقلمند لوگ نصیحت کی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بچّے سنتے ہوئے بھی مزہ لیں اور بات اچھی طرح سمجھ میں بھی آجائے کیونکہ نصیحت کی بات بچّوں کو صحیح تو معلوم ہوتی ہے مگر سننے میں مزہ نہیں لیتے۔اگر بچّوں کو اصول اور قاعدے کے مطابق یہ کہا جائے کہ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوگا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ کبھی جو آدمی دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود بھی اس گڑھے میں گرتا ہے تو اس کا اثر زیادہ ہوگا ۔کیونکہ پہلے بیان سے بچّے کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بنتی لیکن دوسرے طریقے سے بچّے کے سامنے ایک ایسے آدمی کی تصویر اُبھرآتی ہے جو دوسروں کو گرانے کے لیے گڑھا کھود رہا اور بچّے کے سامنے گڑھے میں گرنے کا منظر آجاتا ہے۔ اس طریقے سے بچّوں پر زیادہ اثر ہوتا ہے مثال کے طور پر ذیل میں ایک کہانی پیش ہے :

"کہتے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ایک گھوڑے اور ہرن میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک جنگل میں ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، غرض سب ایک ساتھ تھا۔ لیکن زیادہ میٹھے میں کبھی کبھی کیڑے بھی پڑجاتے ہیں۔ ایک دن کسی معمولی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

مار پیٹ کی نوبت آئی۔ گھوڑے کا جسم تو بھاری تھا ہی ہرن ٹھہرا ہلکا پھلکا۔ اس لیے ہرن نے اُچھل اُچھل کر خوب مرمت کی۔ گھوڑا اس وقت تو مار کھا کر چپ رہ گیا لیکن وہ اس ذلّت کو نہ بھولا اور دل ہی دل میں ہرن کو مارنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اور جنگل میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرنے لگا۔

ایک دن گھوڑے کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو تیر کمان لیے شکار کی کھوج میں پھر رہا تھا۔ گھوڑے نے اس کے پاس جا کر گِڑگِڑاتے ہوئے کہا "بھائی آدمی! اگر میرا ایک کام کر دو تو میں تمام عمر تمھارا احسان مانوں گا۔" آدمی نے کہا "بتاؤ تو سہی کیا کام ہے۔ اگر میرے کرنے کا ہوا تو ضرور کروں گا۔" گھوڑے نے کہا۔ "بھائی آدمی! اس جنگل میں ایک ہرن رہتا ہے۔ اس کا میرا جھگڑا ہو گیا۔ اگر تم اسے مار دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔" آدمی نے کہا۔ "یہ تو بڑی بات نہیں لیکن ہرن بہت تیز دوڑتا ہے۔" گھوڑے نے کہا "میں اس کا پیچھا کروں گا تو تم کمان میں تیر جوڑ کر مار دینا۔" آدمی نے کہا۔ "مجھے تمھارے منہ میں لگام بھی لگانا پڑے گی تاکہ میں تمھیں ہرن کے پیچھے دوڑا سکوں۔"

گھوڑے کو تکلیف تو بہت ہوئی لیکن اس نے لگام لگوائی۔ اب وہ آدمی کو پیٹھ پر لے کر ہرن کی تلاش میں نکل پڑا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ہرن دکھائی دیا۔ اس آدمی نے گھوڑے کو تیزی سے ہرن کے پیچھے دوڑایا کہ ذرا سی دیر میں ایک تیر جو لگا تو ہرن زمین پر آ پڑا۔ گھوڑا اپنے دشمن کو مرا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا "بھائی آدمی، میں زندگی بھر تمھارا احسان مانوں گا۔ تم نے میرے دشمن کا خاتمہ کر دیا۔ اچھا اب اجازت دو۔" "شکریہ"۔ آدمی نے کہا "احسان اور شکریہ کیا؟ مجھے تو تمھارے فائدے کا اب جا کر علم ہوا ہے۔ میں تم کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ تم تو بڑے کام کے جانور ہو"۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ـــــ گھوڑے کے منہ سے لگام نہیں نکلی اور آدمی اس کی سواری کرتا پھرتا ہے"۔

اس کہانی میں ایک اچھی بات بیان کی گئی ہے یعنی یہ کہ جب کوئی دوسروں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو خود اس کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرنا چاہیئے۔ اس کہانی کے ذریعے اس بڑی سچّائی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی شکل ایک قصّے کی سی ہوتی ہے جس میں سچّائی کو بڑے اچھے طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ادب

کا لباس خیالی بھی ہوتا ہے اور اس میں کہانی پن بھی ہوتا ہے۔ جب کسی قصّے کو پڑھتے یا سُنتے ہیں تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک قصّہ ہے۔ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا لیکن اس کے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس میں بڑی سچّائی ہے۔ ایسا واقعہ پیش آسکتا ہے۔

اس قصّے کی خوبی یہ ہے کہ ہم جانتے ہوئے بھی کہ یہ قصّہ فرضی ہے اس سے پورا پورا اثر لیتے ہیں۔ دراصل ادب کا یہ طریقہ ہے کہ ہم اپنی بات کو دوسروں کو سمجھانے کے لئے کبھی کبھی بڑھا چڑھا دیتے ہیں اس لیے لوگ ادیب اور شاعروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "یہ لوگ تو رائی کا پربت بنا دیتے ہیں"۔

بچّوں کے ادب میں ان خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جس سے بچّہ اثر لے سکے۔ ان کہانیوں اور قصّوں کا اثر تادیر ان کے دماغوں میں مسلّط رہے اور انھیں بُرے کام سے روکتا رہے۔

تیسرا باب

اردو میں بچّوں کا ادب

کسی قوم کی ترقی کا دارو مدار بڑی حد تک اس کے بچّوں پر منحصر ہے کیونکہ آج کا بچّہ کل کا شہری ہے۔ انسانی سماج کا پہلا تعمیری نقش بچّوں سے بنا ہے اور ہماری معاشرت کا عکس و اظہار انہیں بچّوں کے ذہن پر مرکوز ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب کے امین اور نگہبان ہوتے ہیں اس لیے ان کی تربیت کا مسئلہ ہمارے علوم میں بنیادی توجہ اور ترجیح کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں بچّوں کی تربیت اور ذہنی نشوونما پر توجہ دی جاتی ہے۔ اردو ادب کی طرح اردو میں بچّوں کا ادب بھی ہے۔ بچّوں کے ادب سے مراد نظم اور نثر کا ذخیرہ ہے جو خاص طور سے بچّوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچّوں کے لیے موزوں ہو۔ یعنی جو ادب چار پانچ سال کے بچّوں سے لے کر تیرہ چودہ سال تک کے بچّوں کے لیے مخصوص ہو۔ جس میں درسی

اور غیر درسی ادب شامل ہے۔ ہم اس کو بچّوں کے ادب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بچّوں کے ادب کے آثار اردو ادب میں شروع ہی سے نظر آتے ہیں مگر ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے یہ بہت بعد میں نمایاں ہوا۔ اردو میں بچّوں کے ادب کا ابتدائی سلسلہ قابلِ ذکر ہے جو "خالقِ باری" جیسی کتابوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرز کی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ غالبؔ کا "قادر نامہ"[1] بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان میں اخلاق و ادب کی جگہ لغت و ذخیرہ الفاظ اور زبان و بیان سکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "تاریخِ ادب اردو" میں امیر خسرو سے

---

[1] ایک مختصر سی کتاب جو بچّوں کے لیے لکھی گئی۔ علی جواد زیدی۔ فروغِ اردو۔ لکھنو۔ مئی ۱۹۶۹ء۔

سعادت علی صدیقی (شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) نے اپنے مضمون "غالبیات پر ایک نظر" میں جو فروغِ اردو لکھنو شمارہ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔ غالبؔ پر کیے جانے والے کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے نیز غالب کی اردو و فارسی تصانیف، ان کے مختلف ایڈیشن، غالبؔ سے متعلق تصانیف ادبی و تنقیدی کتابوں میں غالبؔ پر تنقیدی مضامین اور غالبؔ صدی کے رسائل کے غالبؔ نمبروں پر مشتمل ایک اشاریہ میں "قادر نامہ" کے متعلق لکھا ہے کہ غالبؔ کی یہ تصنیف ان کی زندگی ہی میں "مطبع سلطانی" دہلی سے ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی۔

منسوب "خالقِ باری"[1] کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"ان کی کتاب 'خالق الباری' جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ 'خالق' اور 'باری' ہیں اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور کتاب سمجھی جاتی ہے، جس کو بچّے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"

اردو زبان میں بچّوں کا ادب کئی روپ اور رنگ میں ہمارے سامنے موجود ہے ۔ اس شق میں نصاب کی وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو بچّوں کو سبقاً پڑھائی جاتی تھیں ۔ ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے مختصر حجم کی کہانیاں، قصّے، افسانے، ڈرامے اور اس نوع کے دوسرے مضامین ہیں ان سے بچّوں کے لیے ایک مفید شغل مہیّا ہوتا ہے اور ان کے خیالات و جذبات، ان کے ذہن اور جمالیاتی تربیت کی نشوونما ہوتی ہے۔

اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے نظم اور نثر کی صورت میں ترقی کی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچّوں کے

---

[1] پروفیسر محمود خان شیرانی نے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ "خالقِ باری" امیر خسرو کی تصنیف نہیں بلکہ عہدِ جہانگیری کے ایک شاعر ضیاء الدین خسرو کی ہے جس کا اصل نام "حفظ اللسان" ہے۔

ابتدائی نصاب میں فارسی کتابیں شامل تھیں اور حکومت کا کاروبار فارسی زبان میں ہوتا تھا۔ ان ابتدائی نصابی کتابوں میں نظم و نثر میں بچّوں کی ذہنی ضرورت کا فقدان تھا۔ مشاعروں، ادبی محفلوں اور نجی صحبتوں میں بچے بھلے ہی شریک ہو جاتے مگر ان میں بڑی عمر کے حاضرین کی دلچسپیاں مدِنظر رہتی تھیں۔ اردو میں بچّوں کے ادب پر ایک زمانے تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو نظرانداز کر دیں تو دور دور اس ادب کی نمایاں جھلک نظر نہیں آتی۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد جب انگریز اپنے اثر و اقتدار کو حکمتِ عملی سے وسیع کر کے ملک پر قابض ہوئے اور انگریزی حکومت قائم ہوئی تو ان کی تہذیب اور زبان کا اثر ملک کے مختلف خطّوں کی زبانوں پر پڑا اور اردو جو اس وقت ہندی، ہندوی، ہندوستانی اور اردو کے نام سے ایک عام بولی کی شکل میں ملک کے گوشے گوشے میں نشو و نما پا رہی تھی وہ بھی اس اثر سے محروم نہ رہ سکی۔ جب انگریزوں کو اپنی حکومت اور اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے اردو کی ضرورت محسوس ہوئی تو انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں اور ہندوستان کے ساتھ ربط و ضبط بڑھانے کے لیے ملک کے مختلف مقامات خصوصاً کلکتہ، دہلی اور لاہور میں خاص کوششیں عمل میں آئیں۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اُردو کی اشاعت اور

ترویج میں مدد ملی اور اسی صدی کے نصف اوّل میں انگریزی حکومت نے دفتری کاروبار کے لیے اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔ حکومت کی سرپرستی سے روز بروز ترقی کرتی چلی گئی۔ دلی کالج کی بنیاد پڑی، پنجاب میں اس کی ترقی کی صورتیں نکلیں۔ غیر ملکی عالموں گل کرسٹ، ڈاکٹر اسپرنگر، اور کرنل بالرائڈ کے نام اردو زبان کی ترقی سے وابستہ ہو گئے۔ ہنگامۂ غدر کی ناکامی کے بعد پورے معاشرے میں اصلاحی رجحان پیدا ہونا فطری تقاضہ تھا۔ سرسید، اُن کے رفقاء اور احباب کی بدولت اردو میں علمی و ادبی کتابیں کافی تعداد میں مہیّا ہوئیں مگر بچّوں کے ادب کی طرف توجہ نہ ہو سکی۔ تاہم پنجاب میں کرنل بالرائڈ کی سرکردگی میں جو لٹریچر وجود میں آیا اس میں بیش بہا وافر ذخیرہ ایسا بھی ہے جسے بچّوں کے ادب میں بجا طور پر پیشرو کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

اس زمانے میں مولانا محمد حسین[1] آزاد، خواجہ الطاف حسین[2] حالی، منشی پیارے لال اُشوب، پنڈت حسن بھول اور مرزا ارشد گورگانی جیسے اردو سے لگاؤ رکھنے والے بزرگ لاہور میں موجود تھے۔ ان بزرگوں کی توجہ اور

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔

[2] حالی، نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے یہاں ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنی پڑتی ہے۔

کوشش سے ہالرائڈ کی تجویزیں کامیاب ہوئیں۔ طویل قصّے، کہانیاں، داستانیں اور عشقیہ افسانوی شاعری کے نمونوں کا جائزہ لے کر اس میں اصلاح کی گئی اور زمانے کی ضرورتوں کے پیشِ نظر ہر قسم کے مطالب خواہ ملکی ہوں یا معاشرتی، تاریخی ہوں یا سماجی، آرٹ کے ہوں یا سائنس کے غرض ہر قسم کے تراجم سے اردو مالا مال ہوگئی۔ بچّوں کے مطلب کی کتابیں بھی تیار ہوئیں۔ درسی اور غیر درسی کتابیں ترتیب دی جانے لگیں۔ اردو کی ابتدائی درسی کتابوں میں مولانا آزاد کو امتیازی شہرت حاصل ہوئی۔ یو۔پی اور حیدرآباد میں اسماعیل میرٹھی صاحب کی ریڈرس اور مولوی عبدالحق کی نگرانی میں تیار کی ہوئی انجمن ترقی اردو کی بچّوں کی کتابیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں سے لاکھوں اور کروڑوں بچّوں نے فائدہ اُٹھایا۔ اردو کی درسی کتابوں کا اپنا مقام ہے۔ یہ کتابیں مطالعہ اور ذہنی ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ تاہم درسی کتابوں کا استعمال بالعموم وقتی ضرورت تک محدود ہے۔ اس لیے بچّوں کے لیے عام لٹریچر مہیّا کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ، اسماعیل میرٹھی، اقبالؔ، مسرورؔ جہاں آبادی، چکبستؔ، تکلوک چند محرومؔ وغیرہ فنکاروں نے بچّوں کے اخلاق و عادات اور ان کی ذہنی نشوونما سے متعلق مفید اور ادبی حسن سے آراستہ نظموں کی

تخلیق کے ذریعہ بچّوں کے ادب کی مضبوط بنیاد قائم کی۔ رسائل اور اخبارات کے کالموں میں اس ادب کو نمایاں جگہ دی گئی۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ "پھول" کی مقبولیت سے اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعد کے دور میں اس رجحان کی لَے تیز تر ہوتی گئی۔ ممتاز ادیبوں نے اس حصّۂ ادب کو معیار و منہاج تک پہنچایا۔ بقول شفیع الدین نیّر:

"اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے میں نے "بچّوں کا اخبار" نامی پرچے کے چند شمارے اپنے بچپن میں دیکھے تھے۔ غالباً پیسہ اخبار لاہور کے دفتر سے بچّوں کا یہ پرچہ نکلتا تھا۔ مضامین کی نوعیت کیا تھی یہ تو یاد نہیں البتہ بخوبی یاد ہے کہ یہ پرچے بہت عمدہ چکنے کاغذ پر دیدہ زیب کتابت اور طباعت کا بڑا حسین نمونہ تھے۔"

بچّوں کے ادب کو ترقی بیسویں صدی میں ملی جب کہ اس کی ابتدا انیسویں صدی میں ہو چکی تھی۔ بچّوں کے ادب کی وجہ سے کئی ادارے اور اشاعت گھر چلے مثلاً "دارالاشاعت" پنجاب، "فیروز سنز" لاہور، "انڈین پریس" الہ آباد، "نسیم بکڈپو" لکھنو اور "عبدالحق اکادمی" حیدر آباد وغیرہ بچّوں کے ادب کے سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی داغ بیل پڑی تو اشاعت علوم و زبان کی ضرورت

محسوس ہوئی اور مکتبہ جامعہ وجود میں آیا اور اس ادارے نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی رہنمائی میں بچّوں کے ادب کی طرف خاصی توجہ کی۔ مکتبہ جامعہ کی ان خدمات کا ذکر کرتے ہوئے صدرِ ہند اوّل ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے خط مورخہ ۳ر نومبر ۱۹۵۱ء میں لکھا ہے:

"جامعہ ملّیہ کے اچھے کام سے میں عرصے سے واقف ہوں سنہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اسے شدید نقصان پہنچا۔ لیکن اس نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا ہے اور پھر اُسی طرح کام ہو رہا ہے جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ مجھے ان کی چند مطبوعات دیکھنے کا موقع ملا اور مجھے ہندی اور اردو کی کچھ کتابیں بھینٹ کی گئی ہیں جو زیادہ تر بچّوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور تعلیمی قسم کی ہیں۔

اس قسم کا کام عوام کے لیے ضروری ہے، بچّوں کے لیے بھی اور اور بڑوں کے لیے بھی۔ اور مکتبہ اس انتہائی مفید کام کو ہندی اور اردو دونوں میں سرانجام دے رہا ہے۔ میں مکتبہ کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔"[1]

بچّوں کے لیے جن اصحاب نے نظم و نثر میں کچھ کام کیا ہے اگر جستجو کی

---

[1] فہرستِ کُتب۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۸۲ء

جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچے گی اور دو تین درجن نام تو ایسے مل جائیں گے جن کی تخلیقات کی افادیت اور مقبولیت نے بچّوں کے اردو ادب میں امتیازی مقام حاصل کر لیا ہے۔ منشی سورج نارائن مہرؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد اسماعیل میرٹھیؔ، ڈاکٹر محمد اقبالؔ، منشی تلوک چند محرومؔ، چکبستؔ لکھنوی، محویؔ صدیقی لکھنوی، مولانا حفیظؔ جالندھری، حامد اللہ افسرؔ، مائلؔ خیرآبادی، اندرجیت شرما، لطیف فاروقی اور شفیع الدین نیّرؔ وغیرہ نظم نگاروں میں اور منشی پریم چندر، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر محمد مجیب، کرشن چندر، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر اطہر پرویز، عادل رشید وغیرہ بلند پایہ نثر نگاروں کو کون بھلا سکتا ہے۔

بچّوں کا ادب اس وقت تک بچّوں کا ادب کہلانے کا مستحق نہیں جب تک کہ لکھنے والا خود اپنے آپ کو بالکل بچّہ ہی نہ بنالے اور اسی انداز سے سوچنے سمجھنے لگے اور بچّوں کے لیے لکھے۔ ایک نامور ادیب کا یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ بچّوں کا ادب اس کے لیے ایک کم تر درجہ کی چیز ہے۔ کاش اردو ادب کی ممتاز شخصیتوں کی مانند اردو کا بچّوں کا ادب بھی صحیح معنوں میں ممتاز شخصیتیں پیدا کر سکے جنھیں بچّے جانیں اور پہچانیں۔

اردو میں بچّوں کے ادب کے نقوش ہمیں ابتدا ہی سے دو ہے

اور پہلیوں وغیرہ کے روپ میں ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کے کلام میں بچّوں کے لیے چند نظمیں مل جاتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے بچّوں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ پھر محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، اسمٰعیل میرٹھی، اقبالؔ وغیرہ۔ اِن بزرگانِ ادب کی چند کاوشیں ذیل میں دی جارہی ہیں۔ ابتدائی دور کی دلچسپ پہیلیاں جن کو امیر خسرو سے منسوب سمجھا گیا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ اردو ادب کا حصّہ ہے۔

اندر چملن باہر چلمن اندر کو دل دھڑکے
امیر خسرو یوں کہے وہ دو دو انگل سر کے

——— قینچی

بالا تھا جب سب کو بھایا
بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہدیا اس ناؤں
بوجھے نہیں تو چھوڑ گاؤں

——— چراغ

دس ناری ایک نی نر
بستی باہر وا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم

منہ میٹھا تاثیر گرم

______ خربوزہ

میرؔ کی شاعری کا کچھ حصّہ بچّوں کی دلچسپیوں اور ان کے نفسیاتی رجحانات سے عین مطابقت رکھتا ہے جس کا مطلب ہے کہ انہیں بچّوں سے اُنس تھا۔ جو انسان بلّی اور بکری کے بچّوں سے اس درجہ مانوس ہو وہ بھلا انسانوں کے بچّوں سے کیونکہ مانوس نہ ہوگا۔ علاوہ بریں بچّوں کے شعر وادب کا مقصد ان کی دلچسپیوں سے زیادہ ان کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کرنا، انھیں اچھے سے اچھا شہری بنانا ہے اور یہ مقصد بھی میرؔ کی نظموں سے پورا ہوتا ہے۔ جانوروں سے محبت، غمزدہ انسانوں سے ہمدردی، لین دین میں دیانتداری، سماجی پستی کی فکر معمولات میں افراط وتفریط سے احتیاط برتنا وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو میر تقی میرؔ کی شاعری میں موجود ہیں جسے بچّوں کے ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

میرؔ کی نظم "موہنی بلّی" حسبِ ذیل ہے:

ایک بلّی موہنی تھا اس کا نام — ان نے میرے گھر کیا آکر مقام

ایک دو سے ہوگئی اُلفت بہت — کم بہت جانے لگی اُٹھ کر نپٹ

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ — دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

چھیچھڑا، ٹکڑا، جو کچھ بھی پایا کرے — فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

دخل کیا ہے جھانکے پہ چھینکے کی اور ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور
ایک بلّی کچھ گئی تھی آ کے چکھ یہ لڑی تو منہ پہ پنجہ اپنے رکھ
شوق میں ہمسائیاں اس کے رہیں جو گئی بھی ٹک تو مانگے سے کہیں
پھرنے تو پھرتی کیا دلّی نہ تھی پر جلے پاؤں کی یہ بلّی نہ تھی
ربط ہے اپنے بھی دل کو اس کے ساتھ بیٹھے ہے تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ

نظیر اکبرآبادی نے بھی بچّوں کے لیے بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ان کی ہمدردی صرف بنی نوع انسان تک محدود نہیں بلکہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی انھیں ایک خاص اُنس و محبت ہے۔ ان کی نظمیں "ریچھ کا بچّہ"، "بکری کا بچّہ"، "بلّیوں کی لڑائی"، "ہرن کا بچّہ"، "کبوتر بازی"، "پتنگ بازی"، "تربوز"، ع "کیا وقت تھا جب تھے ہم دودھ کے چوڑے"، اور ع کیا دن تھے وہ بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے"، "ہولی"، "دیوالی"، "بسنت"، "عید"، وغیرہ پڑھ کر بچّے باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظم "آدمی" بہت مشہور و معروف ہے۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا　　شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہا تھا برملا　　یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
قرآن آدمی ہی پڑھیں اور نمازیاں　　اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی　　اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی　　چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا　　اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لے لے لا　　کس کس طرح سے بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا　　اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا　　گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

سرور جہاں آبادی نے بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو

ہر چند کہ نفظی نہیں مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض میں انھوں نے صرف انگریزی نظم کا نام لیا ہے اور اس پر بالکل ہندوستانی طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔ "مُرغابی"، "ترانۂ خواب"، "بچّہ اور ہلال"، "موسمِ سرما کا آخری گلاب" یہ سب اپنے انداز کی دلکش اور بہت عمدہ نظمیں ہیں۔ ایسی ہی نظموں میں "بیر بہوٹی" اور "کوئل" بھی بہترین تخلیقات میں شمار ہوتی ہیں۔ حُبّ الوطنی کے تحت لکھی ہوئی نظموں میں "خاکِ وطن"، "یادِ وطن"، "مادرِ وطن"، "حسرتِ وطن" اور "عروسِ حُبّ الوطن" مشہور ہیں۔

غالباً انیسویں صدی کی آخری دہائی وہ زمانہ ہے جب بچّوں کے لیے درسی کتابیں مہیّا کرنے کا شعوری طور پر احساس، جاگ اُٹھا اور سلیقہ کے ساتھ کتابیں مرتب ہو کر بچّوں کے ہاتھوں پہنچنے لگیں۔ چنانچہ پنجاب میں بھی ایک بارآور کوشش کا نشان ملتا ہے۔ یہ کامیابی مولانا محمد حسین آزاد کے ذہن و تعلیم کا نتیجہ ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کو دیسی کتابوں کی تالیف میں اوّلیت حاصل ہے لیکن ان کی تصنیفی زندگی کی یہ خصوصیت بھی قابلِ احترام ہے کہ پہلے انھوں نے اسی چراغ کو روشن کر کے ملک میں مقبولیت حاصل کی اور بعد میں ادبی تصانیف کی مشعل سے اردو زبان و ادب کو منوّر و تابناک بنایا اور اس خیال کی توثیق ڈاکٹر اسلم فرّخی کے بیان سے ہو جاتی ہے۔

"آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز درسی کتابوں ہی سے ہوا

تھا۔ ادبی تصانیف کے وجود میں آنے سے پہلے ان کی درسی
کتابیں قبولِ عام کا خلعت حاصل کر چکی تھیں[1]"

مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸ر جون ۱۸۶۴ء میں عربی قواعد کا ایک مسودہ محکمۂ تعلیم کے سامنے پیش کیا تھا۔ ۲ر جولائی ۱۸۶۴ء کو انھوں نے منطق کی ایک کتاب تالیف کرنے کی اجازت طلب کی اور بالآخر ۱۸۶۷ء میں محکمۂ تعلیمات میں درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف پر مامور کیے گئے یہ سلسلہ ۱۲ر اگست ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ اردو کی درسی کتابیں قصصِ ہند اور فارسی کی پہلی دوسری کتابیں اس دور کی یادگار ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں مولانا آزاد "دہلوی کالج" لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۶۹ء میں محکمہ کے حکم پر انھوں نے قواعدِ فارسی مرتب کی اور ۱۸۸۴ء میں "جامع القواعد" تالیف کی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے نصابی کتابوں کی سیریز مرتّب کرانے کا رجحان اردو ادیبوں میں پیدا کیا۔ پنجاب میں کرنل ہالرائڈ نے اس رجحان کو عام کیا اور وہاں اردو کی درسی کتابوں کو سلسلہ وار شائع کرنے کی مبارک مہم شروع ہوئی۔ اس میں آزاد کے قلم کی محنت ایک

---

[1] اردو کی پہلی کتاب ص۶ ڈاکٹر اسلم فرخی، جون ۱۹۶۳ء۔ ناشر ترقی اردو بورڈ، اردو منزل، جمشید روڈ کراچی۔

برکت کا درجہ پاگئی۔ انھوں نے اردو کی کتابوں کے دو سلسلے مرتب کیے۔

۱۔ قدیم — جو اُردو کی پہلی اور دوسری کتابوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ جدید — یہ سلسلہ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پر مشتمل ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بچّوں کے ادب میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مثنوی "شبِ قدر" ان کا شاہکار اور اس میں مختلف لوگوں کے اشغالِ شب نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے بیان کیے گئے ہیں۔ طالبِ علم کے بارے میں آزاد فرماتے ہیں۔

ہیں مدرسے کے طالب علم اپنے خیال میں — کل صبح امتحاں ہے سو اس کے خیال میں
مِل جُل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے — پڑھتے جدا جدا ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان میں — کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح سے پہ محنت ضرور ہے

مولانا الطاف حسین حالؔی نے بھی بچّوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ مسدسِ حالی ان کی مشہور و مقبول اور مسلمانوں کو جھنجھوڑنے والی تصنیف ہے اور اس کو تاریخِ ارتقاء ادب اردو میں ایک سنگِ نشان سمجھا جاتا ہے۔ یہ

ایک نیا تارا ہے جو افقِ شاعری پر طلوع ہوا۔ تاریخ عالم میں مسلمانوں کو مرتبہ حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہونے کی اپیل کی گئی ہے۔ یہ کتاب بوڑھے، جوان، بچّے سب کی دل پسند ہے اور یہ کاروانِ علم کے لیے بانگ جرس کا کام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی حالی نے بچّوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک نظم پیش ہے:

اے بھولے بھالے بچّو! نادانو! ناتوانو!
سر پر بڑوں کا سایہ سایہ خدا کا جانو!

حکم ان کا ماننے میں برکت ہے اپنی جانو
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو!

ماں باپ اور استاد ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمھارے نعمت

کڑوی نصیحتوں میں ان کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو!

ماں باپ کا عزیزو! مانا نہ جس نے کہنا
دشوار ہے جہاں میں عزت سے اس کا کہنا

ڈر ہے پڑے نہ صدمہ ذلّت کا اس کو سہنا
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو!

سیکھو گے علم و حکمت ان کی نصیحتوں سے
پاؤ گے مال و دولت ان کی ہدایتوں سے
پھولو گے اور پھلو گے ان کی ملامتوں سے
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو!

تم کو خبر نہیں کچھ اپنے بھلے بُرے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی اتنی ہی عقل چھوٹی
ہے بہتری اسی میں جو ہے بڑوں کی مرضی
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو!

ہے کوئی دن میں یارو! وہ وقت آنے والا
دنیا کی مشکلوں سے تم کو پڑے گا پالا
مانے گا جو بڑوں کی جیتے گا وہ ہی پالا
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو!

ڈاکٹر علامّہ اقبالؔ بچوں کی فلاح و بہبود سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ان کے سامنے تو ہر وقت بنی نوعِ انسان کی بہبود کا سوال رہتا تھا وہ بچّوں کی بہتری سے کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بچّے قوم کے معمار ہیں اور بچّے ہی بڑے ہو کر ملک و قوم کی ساری ذمہ داریاں سنبھالتے

ہیں ۔ انھوں نے اپنے اس خیال کا کئی موقعوں پر اظہار کیا کہ اگر بچّوں کی تربیت میں خامی رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تعمیرِ قوم و وطن کی بنیاد میں خامی رہ گئی ہے ۔ چنانچہ ان کی اب تک کی سامنے آنے والی تحریروں میں سے اوّلین نثری تحریر "بچّوں کی تعلیم و تربیت" ہے جو رسالہ "مخزن" لاہور بابت جنوری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی ۔ لکھتے ہیں :

"تمام قومی عروج کی جڑ بچّوں کی تعلیم ہے ۔ اگر طریقِ تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دینوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثنا خواں بن جائیں ۔ ان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لیے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے "اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کر ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیویں"۔ اس طرح ان کا ہر فعل خود غرضی اور خودداری کے اصولوں پر مبنی نہ ہو ۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت

کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس
کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں[1]"

اور اقبال کا بچّہ دعا کرتا ہے:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خُدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب — علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہے اس راہ پہ چلانا مجھ کو

نئی نسل اپنے تجربے کی بناء پر معترف ہے کہ اردو میں درسی کتابوں کے دو سلسلے نہایت مقبول و مشہور رہے ہیں۔ پہلا سلسلہ محمد حسین آزاد اور دوسرا سلسلہ مولوی اسماعیل میرٹھی کا ہے۔ آزاد کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور

---

[1] اقبال کے نثری افکار۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل۔

اسماعیل میرٹھی کو نقشِ ثانی کی بہتری کا فخر ملا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل نے درسی سلسلے کی حسب ذیل کتابیں مرتب کی ہیں۔

۱۔ اردو زبان کا قاعدہ۔

۲۔ اردو کی پہلی کتاب۔

۳۔ اردو کی دوسری کتاب۔

۴۔ اردو کی تیسری کتاب۔

۵۔ اردو کی چوتھی کتاب۔

۶۔ اردو کی پانچویں کتاب۔

محکمۂ تعلیمات کی ملازمت اور بچّوں کے لیے درسی کتابوں کی ضرورت نے انھیں ریڈریں لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ ان ریڈروں کے لیے ان کے پاس نظمیں مہیّا نہیں تھیں۔ اس لیے خود انھوں نے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ انھیں اس میں خصوصیت حاصل ہوگئی۔

مولانا اسماعیل نے درس و تدریس کے سلسلے میں بچّوں اور بچّوں کے ساتھ انسانی نفس کے مشاہدے اور معلومات کا جو ذخیرہ فراہم کیا تھا اس کو انھوں نے اپنی نظموں میں پورے طور پر کام میں لانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نظمیں بچّوں اور بڑوں سب کے لیے یکساں دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ ان کے موضوع اور طرزِ ادا ہر چیز نہایت سادہ اور موثر ہے۔

ان کی نظموں میں "خدا کی تعریف"، "اسلم کی بلّی"، "ہوا چلی"، "برسات کا موسم" اور "ہماری گائے" کے موضوع اور اسالیب ہم سے اس قدر قریب ہیں کہ ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔

اردو کی پہلی کتاب میں اسمٰعیل میرٹھی نے بائیسواں سبق میں ایک کہانی کے متعلق لکھا ہے کہ اتنی مختصر، دلچسپ جامع اور اثر انگیز کہانی شاید انگریزی ہی میں مل سکے گی جو ذیل میں درج ہے۔

ایک عورت نے ایک بچّہ کو روٹی کا ٹکڑا کھانے کے واسطے دیا۔
کوّا جو دیوار پر بیٹھا تھا 'کائیں کائیں' کر رہا تھا جھپ سے
اُترا اور ٹکڑا چھین کر اُڑ گیا۔ بچّہ رونے چلّانے لگا۔ عورت
بچّہ کا بلبلانا سُن کر یوں کہتی ہوئی دوڑی۔ کیسا کم بخت، لالچی،
دغا باز جانور ہے۔

کوّے نے جواب دیا کہ "جو آدمی اپنے بھائیوں کا مال دغا فریب یا چوری سے کھاتے ہیں پہلے ان کو بُرا کہو وہ تو مجھ سے بھی زیادہ بُرے ہیں"

اوروں کی بُری بات تو بھاتی نہیں تم کو
پر اپنی برائی نظر آتی نہیں تم کو

اس کہانی کی تاثیر بڑھانے اور اس کا اثر پھیلانے کے لیے یہ شعر انتخاب کی بہترین مثال ہے۔

مولانا اسماعیل کی بچّوں کی نظموں میں فطری، مشاہداتی صفاتی اور تمثیلاتی نظمیں شامل ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی بچّوں کی نظموں میں "گائے" سب سے مشہور نظم ہے جو درجِ ذیل ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے بہائی دودھ کی نہریں

خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزے کو پھر گائے نے کھایا

کل جو گھاس ہری تھی بن میں
دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں

کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی جنگل کو سدھاری

پانی پی کر چارہ چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر

پنڈت برج نرائن چکبستؔ کا نام اپنے عہد کے نمائندہ فنکار کی حیثیت

سے امر ہو چکا ہے۔ آپ نے قانونی روزگار اور اردو ادب کی خدمت میں زندگی گزار دی۔ ڈاکٹر سیفی پریمی نے "کلیاتِ چکبست" مرتب کالی داس گپتا رضا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اردو شاعری میں 'گائے' پر اب تک دو نظمیں نظر سے گزری ہیں۔ ایک مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی اور دوسری چکبست کی۔ دونوں نظمیں نہایت عمدہ ہیں[1]"۔ چکبست نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ "خاکِ ہند" اور "رامائن کا ایک سین" ان نظموں کا شمار نوادر میں ہونا چاہیئے۔

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

---

[1] ماہنامہ "کتاب نما"، نئی دہلی۔ نومبر ۱۹۸۱ء۔

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا میر دانش اس وادیٔ کہن میں
گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن میں
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کو
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے گردِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مرکر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

کرناٹک (میسور) کے نامور ادیب و شاعر مولانا شاہ ابوالحسن آدیبؔ (۱۹۶۰ء - ۱۸۸۳ء) نے بھی بچوّں کے ادب کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔
مولانا ادیبؔ کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق قرآن شریف سے ہوئی۔ اس کے بعد اپنے والد محمد بڈھن شریف آشمؔ سے عربی فارسی کی

تعلیم حاصل کی۔ میسور ہائر سیکنڈری اور مولوی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۴ء میں محکمۂ تعلیمات میں ملازمت حاصل کرلی اور ایک مدّت تک مختلف مدارس میں کام کرتے رہے۔ آپ کے ادبی ذوق اور علمی استعداد کو دیکھ کر حکومتِ وقت نے اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کو پنجاب بھیجا جہاں آپ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک چار سال زیرِ تعلیم رہ کر منشی فاضل، ادیب فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات میں امتیازی شان سے کامیابی حاصل کی۔ مولوی فاضل کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آنے پر پنجاب یونیورسٹی سے آپ کو سونے کا تمغہ عطا کیا گیا۔ لاہور میں اورینٹیل کالج میں تعلیم کے اس چار سالہ قیام کے دوران آپ کو علاّمہ اقبال کی شاگردی اور علاّمہ کی تعلیمات و تفکرات سے براہ راست استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔

لاہور سے واپسی پر مولانا ادیبؔ گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور میں فارسی و عربی کے لکچرار مقرّر ہوئے یہاں سے سبکدوش ہونے پر میسور یونیورسٹی نے آپ کی خدمات حاصل کرلیں اور آپ ایک مدّت تک بی۔ اے آنرز کی جماعتوں کو فارسی و اردو کی تعلیم دیتے رہے۔ حکومت کو آپ کی قابلیتوں کا پورا پورا احساس تھا اور حکومت نے آپ سے بعض انگریزی اور کنڑا کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروایا۔ مولانا ادیب برسوں تک محکمۂ تعلیم میں ٹکسٹ بک کمیٹی کے رُکن اور میسور یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز کے

ممبر بھی رہے۔

ادیبؔ سے پہلے یہاں کے مدارس میں وہی کتابیں رائج تھیں جو شمالی ہند والوں کی مرتب کردہ تھیں۔ ادیبؔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں اور انھیں سرکاری مدارس کے نصاب میں داخل کروایا۔ آپ کی مرتب کی ہوئی اردو و فارسی کی درسی اور درسی امدادی کتابوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ "اصولِ تعلیم" آپ کی مشہور تصنیف ہے جس میں آپ نے درس و تدریس کے اصول و طریقوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ "سراج القواعد"، "مسلّم القواعد" اور "قواعدِ اردو" آپ کی یادگار تصانیف ہیں۔ بقول اعجاز صدّیقی مدیر "شاعر":

"شاہ ابوالحسن ادیب ٹریننگ کالج میسور کے لکچرار ہیں۔ آنجہانی مہاراجہ میسور کے درباری شاعر بھی رہ چکے ہیں۔ علم و ادب میں گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ فارسی زبان سے زیادہ شغف ہے متعدد درسی و غیر درسی کتب کے مصنّف و مولف ہیں اور بڑے ملنسار و نیک طینت بزرگ ہیں۔"[1]

مولانا ادیبؔ نے بچّوں کے لیے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر بڑی اچھی

---

[1] ماہنامہ "شاعر" آگرہ۔ مارچ ۱۹۴۳ء

نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک نظم "طالب علم سے خطاب" دی جا رہی ہے۔

طالب علم سے خطاب

وطن کے لیے آج قربانیاں کر
جلاوت دکھا اور جہاں بانیاں کر

نہ دے ہاتھ سے اتحّاد و محبت
سبق مور سے لے سلیمانیاں کر

جو ہیں خشک پودے انھیں سینچ خوں سے
خزاں میں ہو گلستانیاں کر

زمانہ ہو تیری شجاعت کا قائل
طریقِ عمل میں وہ جولانیاں کر

کبھی اَبر بن کر زمانہ پہ چھا جا
کبھی بَرق بن کر درخشانیاں کر

تحیّر بڑھے جس سے اہلِ ہُنر کا
ادیب آج ایسی گل افشانیاں کر

ان بزرگان ادب کے بعد بہت سے ہمارے زمانے کے اصحاب آئے ہیں۔ اگرچہ وہ بھی ہمارے لیے بزرگ ہیں اور ان میں سے کئی ایک ہم میں موجود بھی نہیں رہے ہیں۔ ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، حامد اللہ افسر، تلوک چند محروم، سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، چکبست، شفیع الدین نیّر، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر مجیب، اطہر پرویز، مظہر الحق علوی، مائل خیر آبادی، احمد حکیم فیض پوری، برکت علی فراق وغیرہ۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچّوں کے لیے کہانیاں اس وقت لکھنی شروع کیں جب ہندوستان میں، آزادی کی جدوجہد زوروں پر جاری تھی۔ وطن عزیز کے لیے جاں نثار اور سچّے پرستار پیدا کرنا ان کا اوّلین مقصد تھا۔ جامعہ کا وجود ہی جدوجہدِ آزادی کی تڑپ کا نتیجہ تھا لہٰذا بچّوں کی کہانیاں لکھتے وقت وہ کیونکر اپنے مشن سے غافل رہ سکتے تھے۔ "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی"، "مرغی جو اجمیر چلی"، "عقاب"، "ابو خاں کی بکری"، "آؤ گھر گھر کھیلیں"، "سعیدہ کی ماں"، "منی کی بیماری"، "مرغی کا نرالا بچّہ"، "آخری قدم"، "جولاہا اور بنیا" اور "بیکاری" وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو بوڑھے، جوان، بچّے سبھی ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ بچّوں کے لیے یہ سیدھی سادی دلچسپ کہانیاں ہیں، جوانوں اور بوڑھوں کے لیے ان

میں آزادی، حبِ وطن، انسانیت، تہذیب پر رمز و ایما کی ایک سحر کاری ہے۔ ذاکر صاحب کی کہانی "عقاب" جذبۂ آزادی کو اُبھارتی ہے اور غلامی کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کہانی کے ابتدائی حصّے میں پہاڑ پر گھاس جمنے کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ مستقل مزاجی ہی میں کامیابی ہے۔ آگے چل کر اپنے ماحول سے ایک بلّی کی وابستگی کو ظاہر کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ایک عقاب کسی بھی لالچ سے مقید رہنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ وہ جدوجہد کرتا ہے تو آزاد ہو جاتا ہے اور پھر کہتا ہے "خدا کا شکر ہے، پھر آ پہنچا اپنے وطن میں، پھر پالیا اپنا دیس"۔ لاشعوری طور پر بچّے آزادی کی اس جدوجہد اور تڑپ سے متاثر ہوتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی اخلاقی کہانیاں معلّمانہ بصیرت کے ساتھ اچھے اخلاق اور نیک اطوار کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں تلقین نہیں کی جاتی بس کہانی بیان کر دی جاتی ہے۔

شفیع الدین نیّر بچّوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ملک گیر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی نظموں کے مجموعوں میں "بچّوں کا تحفہ"، "اسلامی نظمیں"، "منی کا تحفہ"، "بچّوں کا کھلونا"، "گھی شکر"، "منی کا گیت"، "ہماری زندگی" وغیرہ جہاں ملک گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں وہیں بچّوں کے لیے لکھی ہوئی تعلیمی

اور اخلاقی کہانیوں کی کتابوں نے بھی اپنی جگہ بنالی ہیں۔ آپ نے بچّوں کے لیے "ڈاکٹر ذاکر حسین کی ایما پر غالب صدی کے موقع پر" غالبؔ کی کہانی" نامی ایک کتاب لکھی جو بچّوں کو اردو کے سب سے بڑے شاعر" غالب کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور ملک میں سند قبول حاصل کر چکی ہے۔ مرزا غالبؔ کی صدسالہ جوبلی کے موقع پر مرزا غالبؔ کو بچّوں سے روشناس کروانے کے لیے شیخ الجامعہ ملیّہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس کی تحریک دلائی تھی۔

بچّوں کے لیے شفیع الدین نیّرؔ کی نظم و نثر کی بے شمار کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جو بچّوں کی ابتدائی اردو تعلیمی ذوق کے لیے موزوں ہیں۔ "مثلاً "گلگلے کی دوڑ"، "ڈھول کا پول"، "میں گھر جاؤں تو کیسے"، "آٹے کا پُتلا"، "مکھن کا ڈبّہ"، "ہشیار حسن"، "ظالم زمیندار"، "پیسے کا صابن"، "انار راجہ"، "پرستان کی سیر"، "بونے کا انصاف"، "انوکھی چھتری"، "عید کے کھلونے"، "طلسمی دنیا" وغیرہ ایسی سادہ، آسان اور دلچسپ ہیں کہ کم سن بچّوں کے لیے سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کی تعمیر میں معاون و مددگار رہیں۔ زندگی بھر بچّوں ہی کے لیے لکھنے والے شفیع الدین نیّرؔ کے اعزاز میں "پیام تعلیم" دہلی نے "نیّرؔ نمبر" شائع کر کے خراجِ عقیدت کیا ہے۔ شفیع الدین نیّرؔ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے:

..."ان میں (نیّرؔ صاحب میں) بچّوں کے ذہن کو سمجھنے اور محبت کرنے

کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلّم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوقِ ادب اور ذوقِ جمال کی سمت بچّوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بچّوں کے لیے جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ ایک پیش رَو کی حیثیت سے ان کا نہایت ہی بیش قیمت کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے، جسے سر کرنے میں بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔ ان کی نظموں نے تعلیم کے خشک کام کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ ان بچّوں میں بھی ادبی دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں جو دوسرے مضمونوں کی طرح مادری زبان کی تحصیل کو غیر دلچسپ سمجھتے تھے۔[1]"

غرض بچّوں کے ادب کے موضوع پر نیّر ایک یادگار شخصیت کے حامل ہیں۔ بچّوں کی نفسیات اور شعور کا ادراک اور اسی نسبت سے ادبی تخلیق کی حسن کاری کا جو ملکہ انھیں حاصل ہے وہ ابھی تک کسی ادیب کو میسّر نہ ہو سکا۔ وہ نظم اور نثر دونوں طریقۂ اظہار کو پوری صناعی کے ساتھ برتتے ہیں۔ نیّر صاحب کی یہ حمد جو بچّوں کی زبان میں کہی گئی ہے بچّوں کے خیالوں کے ساتھ ہے۔

---

[1] غالب کی کہانی ۔ محمد شفیع الدین نیّر۔

حمد

گاتے ہیں ہم تیری بڑائی
تونے بنائی ہے ساری خدائی
تاروں کو چمکایا تونے
روشن چاند بنایا تونے
ہر ہر چیز بنائی تونے
دنیا خوب سجائی تونے
تو دُنیا کا دُنیا تیری
نیّر ساری شان ہے تیری

حامد اللہ آفسر نے بھی بچّوں کے ادبی ذخیرہ کو فکر و شعور کی نئی روشنی دی ہے۔ آپ نے بچّوں کی گہری دلچسپی اور وابستگی سے متعلق بہت سی نظمیں قلم بند کی ہیں۔ ذیل کے کچھ اشعار میں بچّوں کو چاند کے روپ میں دکھاتے ہوئے آفسر صاحب گویا ہیں۔

تم ندی پر جا کر دیکھو
جب ندی میں نہائے چاند

کیسی لگائی ڈبکی اُس نے
ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی ایک سیڑھی لے کر
چھم چھم اُتر آئے چاند
جب تم اس کو پکڑنے جاؤ
پانی میں چھپ جائے چاند
چاہے جدھر کو جاؤ افسر
ساتھ تمھارے آئے چاند

حفیظ جالندھری صاحب "چڑیا اور کوّے کی کہانی" بچّوں کو یوں سناتے ہیں۔

ایک تھی چڑیا ایک تھا کوّا
دونوں نے ایک دن یہ سوچا
آؤ آج پکائیں چاول
دونوں مل کر کھائیں چاول

برکت علی فراق "بڑھیا اور چڑیا" کی کہانی سناتے ہیں۔

آؤ بچّو گیت سنائیں
گیت سنائیں خوب ہنسائیں

اِک بڑھیا نے چڑیا پالی
ننھّی مُنّی بھولی بھالی
بڑھیا بیٹھی کھیر پکاتی
چڑیا اس کو گیت سناتی

مائلؔ خیرآبادی بچّوں سے کہتے ہیں:

نہ سونے کی ضرورت ہے نہ چاندی کی ضرورت ہے
نہ نوکر کی نہ بنگلے کی نہ کوٹھی کی ضرورت ہے
نہ لڈّو کی نہ پیڑے کی نہ برفی کی ضرورت ہے
نہ گھوڑے کی نہ موٹر کی نہ ہاتھی کی ضرورت ہے
ضرورت ہے مجھے ایک اچھے ساتھی کی ضرورت ہے

احمد کلیم فیض پوری چاند کے روپ دکھاتے ہیں۔

چندا ماما آؤ نا — ساتھ ہمارے کھاؤ نا
بدلی میں چھپ بیٹھے ہو — اپنا روپ دکھاؤ نا
نیل گگن میں کیا رہنا — دھرتی پر آجاؤ نا
ایسے ہنستے ہیں تارے — تم بھی اب مسکاؤ نا
کھیتوں اور کھلیانوں میں — اُجیارا پھیلاؤ نا
روٹھ گئے ہو کیوں ہم سے — جلدی سے من جاؤ نا

آشاؤں کے آنگن میں　　چاندی سی بکھراؤ نا
کالے بادل ہٹ جاؤ　　چندا ماما اب آؤ
اور ہمیں نہ ترساؤ

پریم چند نے بچّوں کے ادب میں اضافہ تو نہیں کیا لیکن بچّوں کو کردار کے روپ میں اپنی کئی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی سے ان کا دھیان بچّوں پر مرکوز رہا۔ پریم چند کی شروع کی کہانیوں میں گھریلو اور سماجی مسائل کے علاوہ بچّوں کے رجحانات، ان کی تعلیم، کھیلوں سے ان کی گہری دلچسپی اور ان کی متلون مزاجی کی عکّاسی ہوتی ہے۔ مثلاً "پنچ پرمیشور"، "وماتا"، "بوڑھی کاکی"، "دو بھائی"، "درگا کا مندر"، "مہاتیرتھ"، "دو بیلوں کی کتھا" وغیرہ۔

صالحہ عابد حسین نے بھی بچّوں کے لیے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ طبع زاد کتابوں کے علاوہ معیاری اور مفید کتابوں کے کامیاب ترجمے بھی کیے ہیں۔ اپنی دوسری تحریروں میں بھی بچّوں کی تعلیم و تربیت، ان کے اخلاق کی نمو اور ان کی نفسیات کے مواقع ہاتھ سے جانے نہیں دیئے تاکہ بالغ قارئین بھی اس اہم گوشہ سے واقف ہو جائیں۔

"سنہری بالوں والے بچّوں کا دیس"، "بہادر سندر"، "سندر چنار"، "ایک دیس ایک خون"، "پریم اور سیوا کی جیت"، "بچّوں کے انیس" اور

"زعفران پریوں کے دیس میں" وغیرہ۔ بچّوں کے ادب میں صالحہ عابد حسین کا خوبصورت اضافہ ہے۔ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے بچّوں کے لیے نہ صرف کہانیوں کی کتابیں لکھیں بلکہ مختلف فطرت، مختلف ذوق رکھنے اور مختلف ماحول سے تعلق رکھنے والے بچّوں کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے متنوّع موضوعات پر خامہ فرسائی بھی کی ہے تاکہ ہر بچّہ اپنی ذہنی استعداد اور پسند کے مطابق کتاب کا انتخاب کرکے اس سے محظوظ اور فیض یاب ہو سکے۔ جو کتابیں دوسری زبانوں سے صالحہ صاحبہ نے اردو میں منتقل کی ہیں ان میں قابلِ ذکر کتابیں "بالپو" اور "بڑا پانی" ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بھی بچّوں کے لیے کتابیں اور نظمیں لکھی ہیں۔ "بچّوں کا اقبال"، "اجنتا"، "انتخاب"، "بچّوں کی نظمیں" اور کہانیوں کی کتابیں وغیرہ۔

"ہاتھی کی فوج"، "سوتے جاگتے کی کہانی"، "جنّت کا پھل"، "کوّے کی قبر"، "پیغمبروں کی کہانیاں"، "آخری نبی"، "لاٹھی کا سانپ" وغیرہ شبنم قادری نے بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔

"گلابو چوہیا اور پری زاد"، "گلابو چوہیا اور غبارے"، "انوکھی دکان" "دنیا کے جانور" وغیرہ قدسیہ زیدی کا اضافہ ہے۔

"پھول اور شہد کی مکھی"، "مورا"، "بہادروں کی کہانیاں"، "سدا

بہار کہانیاں"، "سب کا ساتھی سب کا دوست" وغیرہ بچّوں کے لیے انور کمال حسینی کے تحفے ہیں۔

"درختوں کی دنیا"، "گنجے کی استادی"، "ہیراڈاکو"، "سمندری شیطان"، "جن سے مقابلہ"، "چچا مرغ سسرال چلے" وغیرہ بچّوں کے لیے مظہر الحق علوی کی تصانیف ہیں۔

"دنیا کے بچّے"، "انوکھا عجائب خانہ"، "انعامی مقابلہ"، "جیت کس کی"، "چچا غالب"، "چنبیلی"، "آستین کا سانپ"، "چاند"، "دیمک"، "کتنی زمین"، "بندر والا"، "نیا کھلونا"، "سرکس" وغیرہ محمد حسین حسان نے بچّوں کے ادب میں خوبصورت اضافہ کیا ہے۔

ایشیا کے شہنشاہِ قلم کرشن چندر بھی بچّوں سے غافل نہیں رہے تھے۔ "اُلٹا درخت"، "لال تاج"، "سونے کا سیب"، "شیطان کا تحفہ"، "سونے کی صندوقچی"، "بے وقوفوں کی کہانیاں" اور "چڑیوں کی الف لیلیٰ" لکھ کر بچّوں کے ادب میں وافر ذخیرہ مہیّا کر دیا ہے۔

اردو زبان میں بہ نسبت دوسری زبانوں کے بچّوں کے رسائل کی تعداد بہت کم رہی اور ان کی کتابت و طباعت کا معیار بھی اطمینان بخش نہیں رہا۔ تعدادِ اشاعت بھی کم رہی۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ تین چوتھائی صدی سے ملک کے مختلف مقامات سے بچّوں کے رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں

انیسویں صدی کے آغاز میں غالباً بچّوں کا پہلا جریدہ "بچّوں کا اخبار" پیسہ اخبار والوں نے شائع کیا۔ لیکن اس کے چند ہی شمارے منظرِ عام پر آکر اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ ۱۹۰۸ء میں بچّوں کے مشہور ہفت روزہ اخبار "پھول" کی اشاعت شروع ہوئی جسے تمام ہندوستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس عہد کا شاید ہی کوئی بچہ ہو جو "پھول" کے نام سے واقف نہ ہو۔ ملک گیر شہرت کے حامل اس پرچے کو مشہور ادیب و ڈرامہ نویس امتیاز علی تاجؔ کے والد سید ممتاز علی نے جاری کیا تھا اور حفیظؔ جالندھری، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاجؔ اور احمد ندیم قاسمی جیسے مشہور و معروف ادیب و شاعر اس کے مُدیر رہے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں بجنور سے "غنچہ" کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک شائع ہونے والا یہ مشہور جریدہ نامساعد حالات کا شکار ہو کر کچھ عرصہ سے بند ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملّیہ سے ملک کے مشہور ادیب ڈاکٹر عابد حسین نے "پیام تعلیم" کا اجراء کیا۔ نامساعد حالات کا شکار ہو کر ۱۹۴۶ء میں یہ رسالہ بند ہوگیا اور پھر ۱۹۶۴ء میں محمد حُسین حِسان صاحب کی ادارت میں دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔ آج کل اس کے مدیر ولی شاہجہانپوری ہیں۔ اس رسالے میں ملک کے مقتدر ادباء و شعرا کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم بھی شامل ہیں۔ ان کی تخلیق "ابو خاں کی بکری" اسی رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں حکومتِ

ہند کی جانب سے "نونہال" شائع ہونا شروع ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد اس کی اشاعت کچھ عرصہ بند رہی۔ جوش ملیح آبادی کی ادارت میں یہ رسالہ دوبارہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں و پہیلیاں اور کارٹون وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی "نونہال" اس دور کا منفرد رسالہ تھا۔ مگر یہ جریدہ دوبارہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ بعد ازاں ماہنامہ "آج کل" ہی میں بچّوں کے لیے کچھ صفحات مخصوص کر دیئے گئے یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء سے اکتوبر ۱۹۵۶ء تک جاری رہا۔ تقسیم ملک سے پہلے جموں سے "رتن" شائع ہوتا تھا جو بڑا دلکش و دلچسپ جریدہ تھا اور اس کے مُدیر کندن لال تھے۔ لاہور سے ہفتہ وار "گلدستہ" بھی شائع ہوتا تھا جسے بڑی شہرت حاصل تھی۔ ان رسائل کے علاوہ تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں "پریم" نکلتا تھا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں "شمع" کے مُدیر اعلیٰ یوسف دہلوی نے بچوں کے لیے "کھلونا" نامی خوبصورت ماہنامے کا اجراء کیا جو گذشتہ ۳۵ برس سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اپنے دیدہ زیب سرورق، دلچسپ کہانیوں، نظموں، معلوماتی مضامین، کارٹونوں اور پہیلیوں کی وجہ سے یہ بچّوں میں بہت ہی مقبول و معروف ہے۔ ۱۹۴۷ء میں رام پور سے بچّوں کے لیے "الحسنات" کا اجراء ہوا اور ۱۹۵۳ء میں "نور" کا۔ دونوں

کا مقصد بچّوں کو اردو زبان سے واقفیت اور ان میں مذہب سے متعلق معلومات بہم پہنچانا ہے ۔ دونوں جریدے بچّوں کے رسائل کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے حامل ہیں ۔ ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ سے "کلیاں" کی اشاعت شروع ہوئی اور ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ سے دلچسپ ماہنامہ "ٹافی" کا اجراء ہوا۔ اس رسالے کے کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے ۔ یہ بھی بچّوں کا بڑا مقبول رسالہ ہے ۔ ۱۹۶۶ء میں پٹنہ سے ماہنامہ "مسرت" منظرِ عام پر آیا اور کئی برس تک شائع ہونے کے بعد اب بند ہو چکا ہے ۔ ۱۹۷۰ء میں مراد آباد سے "چندا نگری" کی اشاعت شروع ہوئی ۔ ان کے علاوہ متعدد جریدے بچّوں کے لیے وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہوتے رہے لیکن وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے ۔ جیسے "غنچہ" (کلکتہ) "مُنّا" (حیدر آباد)، "چمن" (کانپور)، "پھلواری" (دہلی)، "مُنّا" (بمبئی)، "چاند" (مراد آباد) وغیرہ ۔ علاوہ حیدر آباد سے "نوخیز"، "گلشن"، "دوست" "انعام"، "بچپن"، "میرا رسالہ" وغیرہ شائع ہوئے تھے جو نامساعد حالات کی بنا پر بند ہو گئے ۔

پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی سے شائع ہونے والا مرکزی حکومت کا مقبول عام ماہنامہ "آج کل" سال میں چار مرتبہ بچّوں کے لیے ضمیمہ شائع کر رہا ہے ۔ "ترقیٔ اردو بیورو"، "نیشنل بک ٹرسٹ"، "ایجوکیشنل بک

ہاؤس"، "مکتبہ جامعہ ملّیہ اور جامعہ عثمانیہ نے بھی بچّوں کے ادب کی اہمیت اور افادیت کو سامنے رکھ کر بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جو اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں - ان بڑے اداروں کے ساتھ دوسرے کم معروف اور دور دراز کے اداروں نے بھی اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تعداد کافی ہے اور ان کی مطبوعات بکھری ہوئی ہیں اور مقامی ہو کر رہ گئی ہیں - بچّوں کے ادب کا ایک وافر ذخیرہ مذہب و اخلاق پر مشتمل ہے۔ بعض مذہبی ادارے اس سمت میں ہماری بڑی رہنمائی کر رہے ہیں - اس ضمن میں جماعتِ اسلامی ہند، دہلی، مکتبہ الحسنات رام پور، الجمعیتہ بکڈپو جیسے اداروں کی مطبوعات ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

بچّوں کی صحیح تربیت اور نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے ایسا ادب فراہم کیا جائے جو ان کے لیے فکر انگیز، خیال افروز اور ان کی تعمیر میں مددگار ہو۔ بچّے کا ذہن ہمیشہ متجسّس رہتا ہے۔ اشیاء کی حقیقت سمجھنے کی کوشش میں وہ بار بار پوچھ تاچھ بھی کرتا رہتا ہے۔ ہمارے ادب کی ذمہ داری ہے کہ ان کے جذبۂ تجسّس کی تسکین کا سامان فراہم کرے اور ان کو تخیّل کی بلندی، تیزی اور تندہی حاصل ہو تاکہ وہ صاحبِ نظر بن سکیں۔

اردو میں بچّوں کا ادب ایک نئی نظر کا محتاج ہے۔ ہمارا سرمایہ دوسری زبانوں کے بچّوں کے ادب کے مقابلہ میں کم درجے کا ہے۔ اچھے فنکاروں نے

اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین تخلیقی فنکاروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس ادب کی تخلیق کے لیے معاشرت کے ساتھ ساتھ بچّوں کی ذہنی افتاد، شعور، نفسیات اور احساسات وغیرہ کا گہرا مطالعہ ضروری ہے اور زبان پر اس حد تک قدرت درکار ہے کہ آسان فہم زبان میں موثر طریقہ پر ما فی الضمیر سمجھا سکیں۔

بچّوں کے ادب کی اشاعت کا معقول بندوبست ہونا چاہئے۔ خوبصورت اور دلکش تحریروں کے ساتھ مختلف رنگوں سے مزیّن تصویریں بھی ہوں۔ بچّے تصویروں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کتابت و طباعت کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ آفسیٹ کی طباعت پر زور دینا چاہئے۔ فنِ کتابت کے بہترین نمونوں سے بچّوں کے ذہن میں خوش خطی کا رجحان بھی پیدا ہوگا۔ عمدہ کاغذ اور خوبصورت گٹ اپ سے کتابوں میں صوری حُسن بھی پیدا ہوگا جو بچّوں کو کتابوں سے دلچسپی میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری قوتِ خرید مایوس کن ہے۔ کتابوں کی قیمت مناسب ہوتا کہ ہر خاندان اور ہر بچّہ حاصل کر سکے۔ نیز اس بات کی از حد ضرورت ہے کہ ان مطبوعات کا علم ہر اردو داں کو ہو۔ اردو اشاعت کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ ان مطبوعات کا علم قاری کو مشکل سے ہو پاتا ہے۔ اردو کتابوں کی خرید و فروخت کا نظام غیر تسلی بخش ہے۔ انگریزی کتابوں

کی تنظیم کی طرح ہمارے نمائندے ملک کے گوشے گوشے میں سفر کریں اور ہر کتب خانے سے رابطہ پیدا کریں۔ اخباروں اور رسائل میں مناسب اشتہاروں اور تبصروں کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔ بچّوں کے ادب کی تخلیق کی طرف ممتاز و معروف قلمکاروں کو متوجہ کرانے کی ضرورت ہے تاکہ ترجمہ کا کام کم سے کم ہو سکے۔ ترجمہ تخلیق کا بدل نہیں ہو سکتا اور ترجمہ سے ہمارے مخصوص ثقافتی رجحان کی نمائندگی بھی نہیں ہو پاتی۔ تاہم ہندوستان کے علاقائی ادب کے تراجم علاقائی ثقافت اور تہذیب سے روشناس کراتے ہیں۔

اب جب کہ تعلیم میں پیہم ترقی اور توسیع ہو رہی ہے تعلیم کا معیار اونچا ہو رہا ہے، طلباء کی تعداد روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے، اشاعتی سہولتیں بھی آسانی سے میسّر ہو رہی ہیں۔ اب اردو زبان کے لیے بھی شاید حالات بہتر ثابت ہوں۔ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی، نسوانی معاشرہ کی مصروفیات بھی اس ادب کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ نصاب سے الگ ہٹ کر بچّوں کے لیے یہی ادب ان کا رہنما اور بہترین ساتھی بنے گا۔ ان حالات میں بچّوں کے ادب اور اس کی اشاعت کو نئے امکانات میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تخلیق کے سوتے فی زمانہ اتنے شاداب چاہے نہ ہوں لیکن تراجم اور عالمی ادب کی دنیا اب بھی بیکراں ہے

چوتھا باب

اقبال اور بچّے

الف۔ نثر

۱۔ بچوں کے بارے میں

ڈاکٹر اقبال کو بچّوں کی تعلیم و تربیت میں گہری دلچسپی تھی۔ اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک مضمون بعنوان "بچّوں کی تعلیم و تربیت" لکھا ہے جس میں اقبال فرماتے ہیں کہ

"پڑھے ہوئے شاگرد کو پڑھانا ایک آسان کام ہے مگر اَن جان بچّوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلّم اس کی دقّتوں سے ابھی پورے طور پر آشنا نہیں۔ ہمارا پرانا طریقۂ تعلیم چونکہ بچّوں کے قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارج کو ملحوظ نہیں رکھتا اس واسطے اس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ان کے قوائے ذہنیہ برباد

ہو جاتے ہیں اور ان کے چہروں پر ذکاوت کی وہ چمک نظر نہیں آتی جو اس بے فکری کی زندگی کے ساتھ مختص ہے۔ بڑی عمر میں یہ تعلیمی نقص اور بھی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے۔ روزمرّہ کے معاملات کا سمجھنا اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانا جو ایک عملی طبعیت کے آدمی کے لیے نہایت ضروری اوصاف ہیں ان میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے ان کی زندگی ناکامیوں کا ایک افسوسناک سلسلہ ہوتی ہے اور سوسائیٹی کے لیے ان کا وجود محض معطل ہو جاتا ہے"[1]

اقبال فرماتے ہیں کہ علمی اصولوں کی رو سے بچپن کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ بچّوں میں کون کون سے قوائے کا ظہور پہلے ہوتا ہے۔ عالمِ طفلی کے ساتھ مختص ہونے والے امور کا جاننا ضروری ہے تاکہ بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس ضمن میں انھوں نے گیارہ امور کو ضروری قرار دیا ہے جو درج ذیل ہیں :

۱۔ بچّوں میں ایک قسم کی اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے۔ ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ مثلاً اینٹوں کے گھر بنانا۔ لڑی

---

[1] اقبال کے نثری افکار۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل۔ ۔

میں منکے پرونا وغیرہ۔

۲ - بچّوں میں کسی شے پر مسلسل توجہ نہیں ہو سکتی۔ جس طرح قوائے جسمانی کو ایک جگہ قرار نہیں اسی طرح قوائے عقلیہ بھی ایک نقطہ پر عرصہ تک قرار پذیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا طریق تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ سبق طویل نہ ہو بلکہ چھوٹے چھوٹے حصّوں میں منقسم ہو۔

۳ - بچّوں کو اشیاء کو غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کو چھونے میں لطف آتا ہے۔ نظر کے فعل سے اس کی تسلّی نہیں ہوتی حسِ لامسہ سے بھی مدد طلب کرتا ہے۔

۴ - بچّے کی توجہ صواتِ شے زیادہ رنگِ شے کی طرف رہتی ہے جن اشیاء کا رنگ شوخ ہو اس کا دھیان زیادہ تر اسی کی طرف رہتا ہے۔ اس لیے بچّے کے ابتدائی اسباق رنگین اشیاء کے متعلق ہونے چاہئیں۔

۵ - بچّوں میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادّہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچّے کے سامنے پیش کرے تاکہ اُسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔

۶ - بچّوں میں قوتِ متخیّلہ یا واہمہ بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ بچّے کی اس خصوصیت سے بے انتہا تعلیمی فائدہ ہوتا ہے۔ اکثر مکتبوں میں لڑکے لڑکیاں کاغذ کی کشتیاں وغیرہ بنایا کرتے ہیں یا دن رات بنایا کرتے ہیں۔

قوتِ واہمہ کے لیے یہ اچھی مشق ہے۔

۷۔ بچّوں میں ہمدردی کی علامات ظاہر ہوتی ہیں جن سے بچّوں کی اخلاقی تعلیم میں نمایاں فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ اسے ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سُنائے اور یاد کرائے جس حیوان کے بارے میں بتلانا ہے اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے تاکہ بچّے میں تقلید کی ایک اچھی مثال قائم ہو جائے۔

۸۔ الفاظ کو یاد رکھنے کے لیے بچہ کا حافظہ حیرتناک ہے۔ معلّم کو لازم ہے کہ اپنے شاگردوں کو عمدہ اشعار اور نظمیں یاد کرائے اور پڑھے ہوئے اسباق کی طرف بار بار اشارہ کرے۔

۹۔ بچّوں میں قوتِ متمیّزہ کمزور ہوتی ہے۔ اشیاء کے باریک باریک فرق کی طرف توجہ دلانی چاہیئے۔

۱۰۔ قوتِ عقلیہ مثلاً تصدیق اور استدلال کا کمزور ہونا۔ بچّے سے ایسی فہم کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربہ اور علم سے بڑھتی ہے۔ ان قوائے کے مدارج ترقی کا لحاظ استاد کے لیے نہایت ضروری ہے۔ علمی اصولوں کی رو سے بچّے کے حافظہ پر ایک بے جا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

۱۱۔ آخری خاصہ بچّے کا یہ ہے کہ اخلاقی محرکات سے یا تو بچہ متاثر ہوتا ہی نہیں یا اگر ہوتا ہے تو نہایت ادّنیٰ درجہ پر۔ اس طرح کی تحریکوں کا اثر عملی زندگی

کے دائرے میں ظاہر کرنا ایسا امر ہے جو اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ معلّموں کا فرض ہے کہ ابتدا ہی سے بچّوں میں اخلاقی تحریکوں سے متاثر ہونے کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کامل طریقۂ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہوں۔

معلّم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اوران کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا اُنہی کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے عمدہ و مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لیے بچّے کی نشوونما کا مطالعہ ضروری ہے۔

بچّوں سے اقبال کی دلچسپی ان کی تعلیم و تربیت اور خصوصاً اخلاقی تربیت کی طرف منسوب تھی۔ یوں تو تعلیم علم کا پہچاننا ہے یہ علم خواہ کسی بھی قسم کا ہو مگر تعلیم کے اعلیٰ مقاصد یہ ہیں کہ وہ اشخاص کی فطری صلاحیتوں کو اُبھارے اور ان کی نشوونما کے مواقع فراہم کرے اور ان کے معاشرے کے لیے مفید شہری بنائے۔ جوزف ٹی شپلی نے تعلیم کی تعریف یوں کی ہے۔

"تعلیم علم کے ذریعے انسان کو اُن قوتوں کے استعمال کے قابل بناتی ہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہے"[1]

---

[1] اطراف اقبال - ملک حسین اختر۔

برٹرینڈ رسل نے تعلیم کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مستقبل میں ہم کو اس طرح کا نظامِ تعلیم پیدا کرنا چاہیئے جو ہر لڑکے اور لڑکی کو بہترین چیزوں کے حصّول کے مواقع فراہم کرے۔"[1]

چنانچہ ہر قوم ایک ایسا نظام تعلیم پیدا کرنے کی سعی کرتی ہے جو اس کی ضروریات کو پورا کرے اور اس کے فلسفۂ زندگی سے ہم آہنگ ہو کیونکہ یہ وہ کارخانہ ہے جہاں ملک و قوم کی مشین کے لیے کل پُرزے تیار ہوتے ہیں۔ اگر یہ پُرزے ناقص ہوں تو ظاہر ہے کہ مشین اپنا کام تسلی بخش طریقہ پر نہیں کر سکتی۔

موجودہ زمانہ میں سائنس پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اقبال کا اشارہ ہے کہ آج بھی ہمارے یہاں علم سائنس پڑھے ہوئے لوگوں کی کمی نہیں۔ ہر فن کے جاننے والے یہاں مل جاتے ہیں مگر سب کو شکایت ہے کہ ملک کی رفتار ترقی بہت سُست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ ہُنر تو ہیں مگر اہل دِل موجود نہیں ہیں۔ ہماری روح بیدار نہیں۔ ہم دولت کے انبار لگا کر تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اقبال ہم کو دولت سے بے نیاز کر کے خطروں

---

[1] اطراف اقبال۔ ملک حسین اختر۔

میں جینا سکھانا چاہتے ہیں۔ ہم میدانوں میں خراماں خراماں چلنا چاہتے ہیں اور وہ ہمیں طوفانوں اور کوہساروں سے ٹکرانا چاہتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

بچّوں کے لیے اقبال کے تصوّرِ تعلیم کے مطابق جو نظامِ تعلیم ڈھالا جائے گا اس میں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ بچّے کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہو کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے کیونکہ خود شناسی ہی خودی کی پہلی منزل ہے۔

استاد طالب علم کی صرف رہنمائی کرتا ہے۔ طالب علم خود اپنی ذات کے پردوں کو ہٹاتا چلا جاتا ہے اور بالآخر ایک دن اس سے پوری طرح آشنا ہو جاتا ہے۔ سقراط نے کہا تھا:

"میں دوسروں سے اس لیے افضل ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ جاہل ہوں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ جاہل ہیں۔"[1]

---

[1] اطرافِ اقبال۔ ملک حسین اختر۔

بچّوں پر جبر کرنا۔ اس سے سبق رٹوانا اور ہمارے موجودہ طریقۂ امتحان کے لیے تیار کرنا اس کی فطری صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ خودی کے بلند بام پر چڑھنے کے قابل نہیں رہتا اور مادّیت کی انتھاہ تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔ شروع ہی سے طالب علم کو عملِ پیہم کی عادت ڈالنی چاہیئے کیونکہ اس سے وہ زندگی کے راز سے آگاہ ہوتا ہے۔ عمل پیہم کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم اپنے سامنے ایک مقصد رکھے اور اسے پورا کرنے کے بعد دوسرا مقصد پیدا کرے۔ یعنی وہ تخلیقِ مقاصد کرتا رہے۔ استاد اگر ایک ہی قدم میں اسے آخری زینہ پر پہنچانا چاہے تو کبھی بھی کامیاب نہ ہوگا۔ بچّے کے دل میں آرزو کی تڑپ پیدا کرنا استاد کا کام ہے۔ اس کے بعد وہ خود بخود آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ صرف گاہے گاہے استاد اسے غلطیوں سے بچاتا رہے۔

مغرب کے ماہرینِ تعلیم نے عمل کو تعلیم کا اوّلین زینہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے ایسے مدرسے بھی قائم کیے جن کو مدرسۂ عمل کا نام دیا گیا۔ یہاں بچّے کو کتاب کا کیڑا بنانے کی بجائے کتابِ فطرت کا مطالعہ کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

ایم۔ اے۔ جولین کہتا ہے:

"بچّہ خود اپنی کتاب ہے وہ پڑھنے کے بجائے عمل کرتا ہے۔

اور اس کے مشاہدات اور تجربات کی روح خود قدرت ہے۔ قدرت کی لامحدود تجربہ گاہ میں وہ سبق پڑھتا ہے۔ قدرت بیک وقت استاد بھی ہے اور موادِ تعلیم بھی[1]۔"

علاّمہ اقبال بھی قدرتی مناظر کے مطالعہ پر زور دیتے ہیں کیونکہ فطرت کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور وہ اپنے دامن میں بے شمار سچّائیاں رکھتی ہے۔ کتابوں کے ذریعہ غلامی کا درس دیا جاسکتا ہے مگر فطرت دھوکہ نہیں دیتی بلکہ وہ شاہین صفات پیدا کرتی ہے۔

فیضِ فطرت نے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

روسو کہتا ہے " بچّے کو کتاب نہ دو صرف دنیا کی کتاب اسے پڑھنے دو، کوئی تعلیم نہ دو صرف سچّائیاں اور واقعات بتاؤ۔ جو بچّہ پڑھتا ہے وہ سوچتا نہیں صرف پڑھ رہا ہوتا ہے۔ جو کوئی واقفیت حاصل نہیں کر رہا ہے بلکہ الفاظ یاد کر رہا ہے[2]۔"

---

[1]، [2] اطرافِ اقبال ۔ ملک حسین اختر۔

ڈاکٹر دیوی مانڈرات کے قول کے مطابق :

"پیہم اور منظم مصروفیت تعلیم کی اصل بنیاد ہے[1]"

ایم۔ اے۔ جولین کے نزدیک :

"قدرتی قابلیتوں اور قوتوں اور ہر بچّے کی انفرادی شخصیت کی آزادی" بے حد ضروری ہے۔[2]

علاّمہ اقبال کہتے ہیں :

استاد کو بچّے کی دماغی کمزوری بھی ہمارے معیار کے مطابق ہے۔ اس سے مایوس نہ ہونا چاہئے اسے دیکھنا چاہئے کہ وہ صاحبِ دل ہے یا نہیں کیونکہ الفاظ کے رٹنے والا دماغ حقیقی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔[3]

ڈاکٹر ادولف خیریہ کا خیال ہے کہ اخلاقی تعلیم بھی عمل کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ وہ مزید کہتا ہے :

"تعلیم میں ہمیشہ آنکھ کی تیزی، ہاتھ کی چستی اور قوتِ ایجاد کی دعوت دی جاتی ہے[4]"

علامہ اقبال بھی بچّوں کو شاہین بنانا چاہتے ہیں جو عمل کا پیکر آنکھ کا

---

[1]، [2]، [3] اور [4] اطرافِ اقبال۔ ملک حسن اختر۔

تیز اور استغنا کی مثال ہے۔ وہ عمل اور یقین کی دولت سے انھیں مالامال کر کے خودی کا سبق پڑھاتے ہیں۔ اقبال نے شروع ہی سے یہ کوشش کی کہ قوم کا جمود زائل کیا جائے اس لیے وہ شخصیت اور خودی پر تمام عمر بحث کرتے رہے جو "فنا فی اللہ" ہونے کے بالکل مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں انسانی شخصیت کی نشوونما اور اس کے صحیح ارتقاء پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے لیے دلیسی تعلیم اور باضابطہ نصابوں کے علاوہ اور چیزوں کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ انھوں نے انسان کو بحیثیتِ انسان کے درسِ زندگی دیا، اس کی حقیقت سے آگاہ کیا، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ تجھ میں تمام قوتیں مضمر ہیں تو اپنے آپ کو ڈھونڈ لے مگر غیر سے مدد نہ لے کیونکہ غیر سے بھیک مانگنا انسانی شخصیت کو کمزور کر دیتا ہے۔ اگر تجھے علم کی جستجو ہے تو علم ضرور حاصل کر، مغرب سے لے، مشرق سے اخذ کر مگر تعلیم کی قیمت ذہنی غلامی نہیں ہونی چاہیئے۔ ذہن کی صحیح نشوونما اپنی روایات کی عزت کرنے، اپنی تاریخ کا مطالعہ اور اپنی انفرادی حیثیت کی بقا ہی سے ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے جاوید کو تلقین کی ہے، صرف جاوید ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر بچہ کو

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ مغرب کی ہر چیز رد کر دی جائے۔ اقبال نے ان کے علم و فن کی قدر کرنے کو کہا ہے اور یہ کہ ہمیں ان سے فیض حاصل کرنا چاہیئے مگر اپنی شخصیت کسی طرح گم نہیں کرنی چاہیئے۔ اِسی لیے کتب بینی کو بُرا نہیں کہا مگر کتاب کا کیڑا بن جانے میں بھی انھیں کوئی خوبی نہیں دکھائی دی۔ اگر ذہن کی جلا موجود ہے تو شخصیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے کتابوں کی ورق گردانی درکار نہیں بلکہ ذوق و شوق کی ضرورت ہے۔ انسان کی تعلیم کے لیے اسی تپش کی جسے وہ کوششِ ناتمام بھی کہتے ہیں، ضرورت ہے کیونکہ حرکت عمل کا جوہر ہے اور عملی کشمکش زندگی کا راز ہے۔ جدوجہد اور عمل کی تلقین پر تو انھوں نے دریا بہا دیئے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک صحیح تعلیم ہوتی ہی عمل سے ہے اور عمل نام ہے دنیا کی قوتوں سے برسرِ پیکار ہونے کا۔ وہ ایسا علم نہیں چاہتے تھے جو لاکھ عملی قوت بڑھانے کے باوجود انسان کو اخلاقی قدروں سے بیگانہ کر دے اور چونکہ اخلاقی تعلیم حجرہ کے کونے میں بیٹھ کر حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ میل جول اور لین دین کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے اس لیے ان کے نزدیک بچّوں کے لیے وہ طریقۂ تعلیم جس میں طلباء ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ ملیں اور میل ملاپ سے کام لیں شخصیت کی نشوونما کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کا مطمحِ نظر ان کے فلسفۂ

خودی سے الگ نہیں ہے اور فلسفۂ خودی کی روح عظمت آدم اور احترامِ آدمیت ہے۔ اس کے لیے وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جس کی بنیاد نسل و رنگ یا علاقائی تفریق کی بجائے اخوتِ انسانی اور عالمگیر انسانی برادری پر رکھی گئی ہو اور جس میں بندہ و آقا یا افغانی و تورانی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر ہر شخص کی تکمیلِ خودی کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ تکمیلِ خودی سے مرادِ فرد میں ایسی لچکدار اور متوازن سیرتِ کردار کی تخلیق ہے جس کے سہارے وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے کامیاب گزر سکے۔ چنانچہ ان کا پیغام ہے :

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو

گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اقبال کا خودی کی تربیت و استحکام پر زور دینا، زندگی کے مرحلوں میں فرد کو صرف اپنی ذات پر اعتماد کی تلقین کرنا اور خدا شناسی کے لیے خود شناسی کو مقدم جاننا اس امر پر صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ ذاتی اور انفرادی تعلیم کو رسمی اور مکتبی تعلیم سے کم اہم نہیں جانتے۔ انھیں یقین ہے کہ غیر رسمی تعلیم اور ذاتی تعلیم سے ایک بچّہ اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں

کی مدد سے حاصل کرتا ہے رسمی اور کتابی تعلیم کے مقابلے میں زیادہ صحت مند، توانا، قابلِ اعتماد، حقیقت شناس اور کارگر ہوتی ہے پھر یہ بھی ہے کہ رسمی تعلیم کا سلسلہ مکتب یا اسکول سے شروع ہو کر کالجوں اور یونیورسٹیوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ذاتی اور غیر رسمی تعلیم کا سلسلہ عمر بھر جاری رہتا ہے۔ گویا رسمی تعلیم، تعلیم کا حاصل و مقصود نہیں بلکہ اس غیر رسمی تعلیم کا زینہ ہے جو بچّے میں یقین و خود اعتمادی کی صفات پیدا کر کے اُسے ارتقائے انسانیت اور معراجِ بشریت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم جو بچّے میں زندگی بھر کے لیے جستجوئے علم کا ولولہ پیدا کر دے اور اسے اپنے طور پر خودی کی تعمیر کا موقع فراہم کر سکے، آزاد فضا ہی میں میسّر آسکتی ہے۔ ایسا ماحول جس میں خوف اور مرعوبیت کا دخل ہو، خودی کے ارتقاء اور ذہن کی نشو و نما کے لیے سازگار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اقبال کے نزدیک تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ماحول ان عناصر سے پاک ہو جو طالب علم میں محکومانہ یا غلامانہ ذہنیت پیدا کر سکتے ہوں۔ خواہ یہ غلامی اور محکومی سیاسی و سماجی ہو یا نفسیاتی و معاشی۔ چنانچہ وہ مشرق کے نظامِ تعلیم اسی لیے غیر موثر اور بے روح خیال کرتے ہیں کہ وہ حاکم قوموں کا زائیدہ و مُرتّبہ ہے اور بچوں میں حرّیت و آزادی کی روح پھونکنے کی بجائے انھیں بے عملی، یاسیت، محرومی اور

غلامانہ ذہنیت کا شکار بناتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کو مدرسے، اساتذہ اور طلبا سب سے شکایت ہے کہ وہ ان تعلیمی مقاصد کو پورا نہیں کر رہے ہیں جن کا تعلق فرد و جماعت کو خوف و محرومی کے جذبات سے آزاد کرنے اور ان میں عمل و یقین و سعی و جہد کی تازہ اُمنگیں پیدا کرنے سے ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچّوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اقبال یہاں نام نہ لے درسِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات

اقبال فرماتے ہیں کہ ان درس گاہوں سے طلبہ کی کردار سازی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ تعلیم کیا ہے؟ شاہین بچّوں کو کرگس بنانے کا فن! اس تعلیم کے سبب نوجوان یاس و محرومی کا شکار ہو گئے ہیں۔ نہ ان

میں جوشِ عمل ہے نہ جذبۂ خودداری۔ نظام کیا ہے؟ مذہب و اخلاقیات کے خلاف ایک سازش! پڑھانے والوں میں نہ افکار کی لذّت ہے، نہ خیال کی جدّت اور نہ علم کی گہرائی۔ یہی حال پڑھنے والوں کا ہے۔ نہ ان میں تحصیلِ علم کی لگن ہے، نہ حقائق کی جستجو، نہ تعمیرِ خودی کا ذوق و شوق۔ تجدید و ایجاد کی بجائے ہر بات میں تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ طلبا کی نظر سطح بینی سے آگے نہیں بڑھتی اور زندگی کے رموز و حقائق ان کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

یہ باتیں اقبال نے یونہی نہیں کہیں بلکہ عمیق مطالعے، گہرے مشاہدے اور ذاتی تجربوں کے بعد کہی ہیں۔ ان کو مکتب کی ابتدائی تعلیم سے جامعات کی اعلیٰ تعلیم تک کا ذاتی تجربہ تھا۔ علاوہ انھوں نے مغرب کی اعلیٰ درس گاہوں میں بھی تعلیم پائی تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا نے انھیں غیر معمولی حکیمانہ نظر بھی عطا کی تھی۔ اس لیے ان کی نگاہیں تعلیم کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اُلجھ کر نہیں رہ گئیں بلکہ اس کی تہہ تک پہنچی ہیں۔ اقبال کی نگاہ میں بچّوں کے علم کا معیار و مقصود یہ ہے کہ وہ زندگی کا محافظ اور خودی کا معاون ہے۔ حقیقی علم سے عقل و خرد میں پاکیزگی آتی ہے۔ لیکن عہدِ حاضر کی درس گاہوں میں بچّوں کے لیے جس قسم کے علم کی تحصیل و ترسیل پر زور دیا جا رہا ہے وہ اقبال کے نزدیک

اس معیار و مقصود پر پورا نہیں اُترتا بلکہ اس میں ایسی کجی ہے کہ وہ آگہی کی روشنی بخشنے کے بجائے آنکھوں پر جہالت کے دبیز پردے ڈال دیتا ہے۔

اقبال یہ بھی چاہتے تھے کہ بچّوں کے نظامِ تعلیم میں علومِ جدیدہ کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت اور نصاب میں اس کی شمولیت کے مسئلے پر انھوں نے کئی موقعوں پر اپنے کلام میں اظہارِ خیال کیا ہے"۔ رموزِ بیخودی" میں بتایا ہے کہ تاریخ کوئی فرضی داستان یا افسانہ نہیں ہے۔ یہ خود آگہی اور کارکشائی کی ضمانت دیتی ہے، ماضی سے حال کو روشن کرتی ہے اور مستقبل کو حال کی مدد سے تابناک بناتی ہے۔ اس سلسلے میں نومبر ۱۹۲۹ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"— ایک دوسری بات جس پر زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں، میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام

میں کیا ہو رہا ہے ۔ چونکہ ہم جدید تہذیب اور شائستگی کے اصولوں سے نا واقف ہیں اس لیے ہم علومِ جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علومِ جدیدہ پر اصولِ استقرائی عاید کیا گیا ہے ۔ یہ وہ نصیحت ہے کہ قرآن شریف نے دنیا کو عطا فرمائی ہے[1]"

ضربِ کلیم میں "تربیت" [کلیاتِ اقبال (حصّہ ضربِ کلیم ۔ صفحہ ۷۹، صدی ایڈیشن)] کے عنوان سے زندگی اور علم کا مقابلہ کرتے ہوئے اقبال نے بتایا ہے کہ ہماری درس گاہیں دانش و حکمت کی راہیں تو کھول دیتی ہیں لیکن زندگی کا ولولہ پیدا نہیں کرتیں ۔ اہلِ دانش کو اہلِ نظر نہیں بناتیں اور سوزِ دماغ سے آگے بڑھ کر سوزِ جگر سے آشنا نہیں کرتیں ۔ گویا مکتب کی تعلیم دانش افروز تو ہوتی ہے حیات خیز نہیں ہے ۔

شاہین، اقبال کا اچھوتا اور محبوب پرندہ ہے ۔ ان کے کلام میں پرندوں کا وجود خوبصورتی کے لیے ہے نہ نغموں کے لیے ۔ اقبال کو ان پرندوں کے

---

[1] اقبال سب کے لیے ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۔

ظاہری حسن و قبح سے سروکار نہیں بلکہ ان کا مزاج اور فطرت مطلوب ہے۔ اس امر کے پیشِ نظر وہ پرندے کے وجود سے زندگی اور فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے کردار نگاری کرتے ہیں۔ ع

خراب کر گئی شاہین بچّہ کو صحبتِ زاغ

شاہین بچّہ کے لیے شاہین کی صحبت کی ضرورت ہے تاکہ وہ شاہین کے آدابِ زندگی سیکھ سکے اور اُسی فضا میں پرواز کر سکے جو شاہین کی فضا ہے۔ اس کی عادتیں وہیں ہوں جو شاہین کی ہیں۔ اس کی طبعیت اسی مزاج اور نہج پر ڈھلنا چاہیئے جو شاہین کی فطرت ہے۔ زاغ کی صحبت اسے راس نہیں آسکتی کیونکہ شاہین بچّہ کو زاغ کے خصائل سے نہیں بلکہ شاہین کے اوصاف سے متصف ہونا ہے۔ زاغ کی صحبت زاغ کی عادت ہی پیدا کر سکتی ہے شاہین کے محاسن پیدا نہیں کر سکتی اس لیے زاغ کی صحبت شاہین بچّے کے لیے صالح صحبت نہیں ہے۔ دراصل اقبال شاہین بچّوں (مراد قوم کے بچّوں) کے لیے زندگی کی صحیح ڈگر متعین کرنا چاہتے ہیں جس پر چل کر وہ اپنی منزل کو پالیں جس سے ان کی تربیت بطریقِ احسن ہو سکے جس سے ان کی صحیح فطرت کے نقوش اُجاگر ہوں۔ اس خیال کو اقبال نے اپنے اشعار میں بھی واضح کیا ہے۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے

پھر ان شاہیں بچّوں کو بال و پر دے

قوم کے بچّوں کی تربیت اسی انداز سے ہونی چاہیئے جس سے ان کی فطرت کے صحیح جوہر آشکار ہوں، جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر اور اخلاق کی تشکیل کما حقہ ہو سکے۔ لہٰذا قوم کے بچّوں کے لیے ایسے ماحول اور معاشرے کی ضرورت ہے جس میں وہ شاہین کی صفات پیدا کر سکیں اور صحبت زاغ یعنی بری صحبت سے محفوظ رہ سکیں۔ اس طرح ان کی پرورش فطرت کے مطابق ہو سکتی ہے۔ تیزی، تندہی، جھپٹ شاہین کی افتادِ طبع میں داخل ہے اس لیے یہ جمود، سہل پسندی اور کم کوشی کا شکار نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا خون گرم رہتا ہے جو اس کے شکار کی فطرت کو برقرار رکھتا ہے۔ اقبال قوم میں شاہین کی اس صلاحیت کو کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ بچّوں کے لیے

علاّمہ اقبال نے بچّوں کے لیے صرف نظم ہی میں نہیں بلکہ نثر میں بھی بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے۔ انھیں تصنیف و تالیف کا شوق ابتداہی سے تھا۔ علمی و ادبی دنیا میں ان کی شہرت کو دوام تو ان کے اشعار اور فلسفیانہ موضوعات پر بعض نثری کتابوں کی اشاعت کے بعد میّسر آیا۔ ان کی پہلی تصنیف معاشیات کے موضوع پر "علم الاقتصاد" کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اقبال کی طبیعت کو تصنیف و تالیف سے طبعی مناسبت تھی۔ خود علاّمہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کو ایک خط میں لکھا ہے۔

"تصنیف و تالیف کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے "علم الاقتصاد" پر اردو میں سب سے پہلی مستند کتاب میں نے لکھی ہے"[1]

یہ سلسلہ تادمِ آخر قائم رہا۔ ان کی تصانیف نظم و نثر میں ہیں اور موضوع

---

[1] شادِ اقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری۔

کے لحاظ سے اہم اور متنوّع ہیں۔ کچھ کتابیں مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ خطوط و مقالات اور بعض دوسری تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں میں بیشتر علاّمہ کی زندگی ہی میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آگئی تھیں اور کچھ کتابیں جن کا تعلق متفرق نثری تحریروں اور کلام کے غیر مطبوعہ بکھرے ہوئے اجزاء سے ہے، دوسروں کی ترتیب و تدوین سے علاّمہ کی وفات کے بعد شائع ہوئیں ان کے علاوہ علاّمہ اقبال نے چند نصابی کتابیں بھی مرتب کی تھیں جو حسب ذیل ہیں :

۱۔ اردو کورس	چھٹی جماعت کے لیے
۲۔ اردو کورس	ساتویں جماعت کے لیے
۳۔ اردو کورس	آٹھویں جماعت کے لیے

۴۔ تاریخِ ہند

۵۔ آئینہ عجم

۶۔ انتخابِ بیدلؔ

یہ کتاب اودھ اور صوبۂ پنجاب کے تعلیمی نصاب کے لیے مرتب کی تھیں۔ اردو کورس کی کتابیں حکیم احمد شجاع کے تعاون سے ترتیب دی گئیں اور گلاب چند کپور اینڈ سنز کے زیرِ اہتمام لاہور سے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئیں۔ تینوں کتابوں پر ایک ہی دیباچہ ہے۔ "تاریخ ہند"

لالہ رام پرشاد پروفیسر تاریخ، گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے مرتب ہوئی اور پہلی بار ۱۹۱۳ء میں منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے لاہور سے شائع کی۔ "آئینہ عجم" فارسی نظم ونثر کے منتخبات پر مبنی ہے۔ اقبال نے اسے میٹریکولیشن کے طلبا کے لیے مرتب کیا تھا جو ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ "انتخاب نکاتِ بیدلؔ"، جدید بی۔ اے کورس (فارسی) کے لیے ترتیب دی گئی اور ۱۹۲۲ء میں لاہور سے طبع ہوئی۔[1]

علامہ اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال کو بچپن میں "ببّا" کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے کھیلنے کے لیے بکری کا ایک بچّہ بھی رکھ لیا تھا۔ ایک روز جاوید بکری کے بچّے سے کھیل رہے تھے اور علامہ اسے دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ جاوید کی والدہ کو نہ جانے کس طرح یہ خیال آیا کہ علامہ نے جاوید کے لیے کوئی شعر نہیں کہا ہے۔ انھوں نے علامہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ نے بے شمار اشعار کہے ہیں لیکن جاوید کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا" علامہ نے فرمایا "یہ کون سا مشکل کام ہے لو ابھی کہہ دیتے ہیں۔ اس پر آپ نے پنجابی میں یہ اشعار کہے:

اک سی ببّا بکری والا

---

[1] اقبال سب کے لیے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔

ہتھ وِچ رکھدا ڈنڈا
نانی جو اونہوں پھڑن لگی
نسیا مار پچھنڈا

بھابی ببّا بکری والا
نالے کھاندا توس تے انڈا
نالے کھاندا حلوہ منڈا

بھابی ببّا بکری والا

فقیر سید وحید الدین کے ایک عزیز کو کتّے[1] پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ فقیر صاحب اپنے عزیز کی موٹر میں علّامہ سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ موٹر میں کتّے بھی تھے۔ یہ لوگ علّامہ کی خدمت میں جا بیٹھے اور کتّوں کو موٹر میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد علّامہ کی بیٹی منیرہ بھاگی بھاگی آئی اور کہنے لگی "ابّا جان موٹر میں کتّے آئے ہیں"۔ علّامہ نے مہمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹا یہ تو آدمی ہیں"[2]

علّامہ اقبال بعض اوقات بچّوں کے ساتھ شعر میں دل لگی کیا کرتے تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں ان کے نہایت عزیز دوست تھے۔ نواب زادہ

---

[1] اور [2] اردو ڈائجسٹ "ہما" اقبال صدی نمبر۔ اگست ۱۹۷۷ء۔

خورشید علی خاں ان دنوں چھوٹے سے تھے۔ کوٹھی "زراغشاں" (کوئنز روڈ لاہور) کے سبزہ زار پر یوکلپٹس کے درخت تھے جن سے گوند نکلا کرتی تھی۔ نواب زادہ جن کی عمر اس وقت کوئی نو دس سال کی ہوگی دن بھر ان درختوں سے گوند کھرچ کھرچ ڈبّوں میں بھرا کرتے تھے۔ نواب زادہ صاحب کا بیان ہے کہ علاّمہ ہماری موٹر میں آتے اور اُترتے ہی مجھے بُلاتے "چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو" میں کہتا "گوند نکال رہا ہوں" تو فرماتے ؏

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

میں کہتا "بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعہ پر ختم ہوگئی" فرماتے "ہاں بھئی ابھی تو ایک ہی مصرعہ ہوا ہے"۔ میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپ کیسے شاعر ہیں دوسرا مصرعہ ہی نہیں کہہ سکتے۔ آخر ایک دن تشریف لائے تو فرمایا "لو چھوٹے میاں آج ہم نے دوسرا مصرعہ بھی کہہ لیا ہے"۔

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی ان کی شادی کسی نیک بخت سے[1]

جب والدۂ جاوید کا انتقال ہوا تو جاوید اور منیرہ چھوٹے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے اقبال نے ایک جرمن خاتون مس ڈورا لینٹ ویرا

---

[1] تبرکاتِ اقبال۔ مرتب محمد مشیر الحق۔

کو مقرّر کیا تھا۔ وہ بچّوں سے اقبال کی دلچسپی بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"جب تک بچّے اسکول سے واپس نہیں آتے تھے وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ان دنوں وہ بہت کمزور تھے ہر وقت پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ مگر دوپہر کا کھانا کھانے کے کمرے میں آکر بچّوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ ان سے باتیں کرتے، اسکول سے متعلق، تعلیم سے متعلق اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

رات کے کھانے کے بعد جاوید اور منیرہ باقاعدگی سے ان کے پاس آتے۔ علاّمہ انہیں کہانیاں سناتے، باتیں کرتے۔ بالو ان کے کمرے میں دوڑتی پھرتی۔ بڑی شریر تھی اور ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوتے تھے۔ اس کے بعد بچّے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ علاّمہ کو بچّوں کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ ان کی ماں مر چکی تھی۔ میرے بعد ان کا کیا بنے گا وہ سوچتے اور کہا کرتے 'بچّے بہت چھوٹے ہیں'۔"

جاوید اور منیرہ کی تعلیم کے بارے میں وہ بتاتی ہیں "علی گڑھ میں پروفیسر صدیقی علاّمہ اقبال کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ اقبال بہت بڑا مفکر ہے اور بہت

بڑا انسان ہے۔ اور اس وقت وہ دنیا میں مشہور ہو چکے تھے۔ جب میں لاہور پہنچی تو مجھے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ بانو (منیرہ) اور جاوید دونوں اسکول جاتے تھے۔ میرے آنے سے پہلے ہی انھیں قرآن پڑھانے کے لیے مولوی صاحب مقرّر تھے۔ جاوید سینٹرل ماڈل اسکول میں پڑھتے تھے اور بانو ایک مسلم اسکول میں۔ لیکن مجھے وہ اسکول پسند نہیں آیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی تو انھوں نے کہا آپ بانو کو اپنی مرضی کے اسکول میں داخل کرا سکتی ہیں۔ میں نے کہا میں اس شہر میں نئی ہوں، نہیں جانتی اچھا اسکول کون سا ہے، آپ کسی سے کہیں کوئی اچھا اسکول تلاش کر کے بتا دیں۔ انھوں نے کہا یہ کام خود آپ کو کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے طور پر تمام گرلز اسکولوں کا جائزہ لیا اور بانو کے لیے کینرڈ اسکول پسند کیا۔ مشنری اسکولوں میں تمام بچّے صبح مذہبی رسوم میں شرکت کرتے تھے۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس کے متعلق بتایا تو انھوں نے کہا مجھے بانو کے اسکول کے مذہبی رسوم میں شرکت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے خود بائبل پڑھی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اسکول میں

دیگر بچّیوں کی طرح پڑھے مگر ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے
متعلق بھی پوری تعلیم دی جائے تاکہ وہ مذہب کی روح
سے آگاہ ہو اور خود اس کو سمجھنے کے قابل ہو۔"[1]

اقبال نے غلام قوم کے دل میں نہ صرف آزادی کا جذبہ پیدا کیا بلکہ ان کو بتایا کہ آزاد ہونے کے بعد بھی اکثر غلامی کی بو باس نہیں جاتی - اگر ہم اپنی اصلاح خود نہیں کرتے، اگر ہمیں عزت کا خود احساس نہیں ہے تو آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی - ہمیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو بہتر بنائیں - ہم کو اللہ تعالیٰ نے جو قوت اور صلاحیت دی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں - علّامہ اقبال نے اپنی ایک فارسی کتاب میں ایک چھوٹا سا قصّہ لکھا ہے -

"کسی چراگاہ میں بہت سی بھیڑیں رہتی تھیں - چونکہ یہاں بہت چارہ تھا اس لیے ان بھیڑوں کی نسل خوب پھلی پھولی اور ان کی تعداد بھی بڑھ گئی - اتفاق کی بات ہے کہ پاس ہی کے جنگل میں کہیں سے کچھ شیر آکر رہنے لگے - انھیں جب بھی بھوک لگتی تو وہ کچھ بھیڑوں کا شکار

---

[1] اردو ڈائجسٹ "ھما" اقبال صدی نمبر - اگست ۱۹۷۷ء -

کر لیتے اور ان کو کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔ بھیڑیں بہت پریشان ہوئیں مگر شیر سے بچنے کی تدبیر اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔

ایک بوڑھی بھیڑ سب سے زیادہ عقلمند تھی اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ اس نے سوچا کہ ان بھیڑوں کو شیر بنانا تو ممکن نہیں لیکن کوئی ترکیب کرنا چاہئے جس سے شیر اپنی عادتیں چھوڑ دیں۔ پھر ان میں اور شیروں میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ چنانچہ اس نے شیروں کے کچھار میں کہنا شروع کیا کہ مجھے خدا نے اپنا پیغام دے کر تمھارے پاس بھیجا ہے اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ جو بھیڑوں کو کھا کھا کر زندگی گذارتے ہیں ان کی موت قریب ہے۔ اگر ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ساگ پات پر گزارا کرو اور اپنے آپ کو مٹا لو کیونکہ جنّت میں صرف کمزور ہی جا سکتے ہیں۔

اس بھیڑ کے وعظ کا یہ اثر ہوا کہ شیر گھاس پھوس کھا کر گزارہ کرنے لگے اور جنّت کے خواب دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان کی ہمت بالکل جواب دے گئی اور ان میں اور بھیڑوں میں کوئی فرق نہ رہا۔"[1]

---

[1] بچوں کے اقبال۔ ڈاکٹر اطہر پرویز۔

اس قصّے کے ذریعہ اقبال جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

اقبال نے قرآنی تعلیمات پر بہت زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب انسانوں کے لیے ہے۔ اگر انسان بے عملی کی زندگی گذارے، خود کچھ نہ کرے تو یہ بے عملی اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اقبال کے عمل کے بیان میں گہرائی اور توانائی ہے۔ اقبال اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی شخصیت کی تشکیل کے لیے انھوں نے جن افراد کو اپنا مخاطب بنایا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن کی رگوں میں شباب کا خون گردش کرتا ہے اور جو قوت و حرارت کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ باالفاظِ دیگر اس منزل پر اقبال "جوانوں کو بوڑھوں کا استاد کردے" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب جوانوں ہی پر اقبال کے جہانِ نَو کی تشکیل کا انحصار ٹھہرا تو وہ ان جوانوں کی تعلیم و تربیت سے کیسے غافل رہ سکتے۔ "ضربِ کلیم" میں تعلیم و تربیت کے عنوانات کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کے نظریات اس لیے بھی قابلِ توجہ اور گرانقدر ہیں کہ اقبال کو مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ معلّم کے فرائض ادا کرنے کے مواقع بھی میسر آئے تھے۔

انھوں نے اسکول کے طلبا کے لیے اردو کی درسی کتابیں بھی تیار کی تھیں اور پھر کچھ عرصہ لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے بھی نئے نظامِ تعلیم سے پیدا شدہ مسائل کا جائزہ لینا پڑا تھا۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ اقبال تعلیمی مسائل میں عملی دلچسپی لیتے رہے ہیں اور ان کے خیالات ایک تجربہ کار اُستاد کے خیالات ہیں۔ لہٰذا کھوئے ہوئے وقار اور چھینی ہوئی عظمت کے دوبارہ حصول کے لیے انھوں نے قوم کو عمل کا درس دیا۔ وہ ایک منظم تعلیمی پروگرام پیش کرتے ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل کے باہمی رشتہ پر منحصر ہے۔ وہ جدّت اور ندرت کے دلدادہ ہیں اپنے تپشہ سے اپنا نیا راستہ بنانے کی دعوت دیتے ہوئے دوسروں کی راہ پر چلنے کو عذاب قرار دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود تعلیم و تربیت کے میدان میں روایت کے محافظ اور اپنے ماضی سے رشتہ قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ مستقبل کے درخشاں چہرے پر ماضی اور حال کے جھروکے سے نظر ڈالنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مستقبل کی منزل تک پہنچنے کے لیے سلامتی کی راہ ان کے خیال میں اپنے ہی ماضی کی اور حال کی راہ ہے۔

اقبال اور بچّے

ب۔ نظم

۱۔ بچّوں کے بارے میں

نظم "جاوید کے نام" میں اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کر کے نئی نسل سے ہم کلام ہوئے ہیں۔ اقبال کو جدید تعلیم یافتہ طبقے سے خصوصاً نوجوانوں سے اصل شکایت یہ ہے کہ ان کے ذہن مرعوبیت کا شکار اور ان کا تفکّر افرنگ زدہ ہے۔ نہ ان کی اپنی کوئی سوچ ہے۔ نہ اپنی ذاتی رائے۔ تخلیق و اختراع کی قوت معدوم ہوتی جا رہی ہے تقلید کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ بے یقینی و لادینی نے انھیں اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار کرنے سے بھی گریزاں نہیں۔

اقبال کو نئی نسل سے یہ بھی شکوہ ہے کہ وہ تن آسان، بے عمل اور بے قوت ہوتی جا رہی ہے۔ مغرب پرستی کا رجحان اتنا غالب آگیا ہے کہ اپنی چیزوں کی قدر و قیمت اس کی نظروں سے گرتی جا رہی ہے اور غیر کی

ہر چیز محترم بنتی جا رہی ہے۔ اقبال نے اپنے فرزند کو حقائق و معارف سے آگاہ کیا۔ نصائح بھی کی ہیں اور دعائیں بھی دی ہیں۔ وہ نظمیں جو اقبال نے "جاوید کے نام" سے کہی ہیں۔ ان میں بھی وہ جاوید کے درپردہ قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے۔ نظم "جاوید کے نام" سے اقبال نے دو نظمیں "بالِ جبریل" میں شامل کی ہیں۔ ایک نظم "کلیاتِ اقبال" (صدری ایڈیشن) ۱۹۸۱ء کے حصّۂ "بالِ جبریل میں صفحہ نمبر ۱۱۵ - ۱۱۶ پر ہے جس میں سوز خودی اور سازِ خودی کی کیفیت سے آگاہ کیا ہے۔ بے حیائی اور عریانی سے محفوظ رہنے کے لیے دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کج کلاہوں اور کافر نگاہوں کی دست بُرد سے محفوظ رکھے۔ خودی کی تربیت خانقاہوں میں نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں ذہنی تربیتوں یا ذہنی قوتوں کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے اور ذہنی تربیت تکمیلِ خودی کے لیے شرطِ اوّلین ہے۔ اقبال اپنے فرزند سے فرماتے ہیں کہ میں چونکہ بفضلِ خدا ظریف و زیرک، ذہین و طباع اور دولتِ فکر کا مالک ہوں اس لیے خانقاہی رنگ سے محفوظ رہا۔

اقبال کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اس بے یقینی و لادینی اور تنقیدی رجحان کا ذمہ دار نوجوانوں سے کہیں زیادہ وہ معاشرہ ہے جس میں نو ں نے آنکھ کھولی ہے اور تربیت پائی ہے اس لیے وہ

نوجوانوں کی باز پرس کرنے کی بجائے عام طور پر ان کے ماحول یعنی عصرِ حاضر کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ نوجوانوں کی گمراہی اور انتشارِ ذہنی کا اصل سبب ان کے گرد و پیش کی محکوم فضا اور اس میں سانس لینے والوں کی غلامانہ ذہنیت ہے۔ غلامی ایسی لعنت ہے جو انسانوں کو ذوقِ حُسن سے محروم کر دیتی ہے کہ محکوم خود کو حکومت کا ایک جُز سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہوتا صرف یہ ہے کہ اس کے قوائے عمل اور جوہرِ ذاتی خرید لیے جاتے ہیں۔

اقبال کی آہِ سحرگاہی سے ملک و ملّت کو ان کی زندگی میں نہ سہی بعد ہی میں سہی محکومی کے عذاب سے نجات مل گئی۔ یہ وہ معیارِ عزم و حوصلہ تھا جسے اقبال نے نوجوانی میں اپنے لیے پسند کیا۔ اسی معیارِ فکر و نظر کی توقع وہ نوجوانوں سے کرتے تھے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ محکومی و غلامی کے سبب جو کچھ ان سے نہ ہو سکا نئی نسل اس کی بھی تلافی کرے۔ ان کی یہ آرزو کتنی شدید تھی اور دل میں کس قدر سما گئی تھی اس کا اندازہ ایک مختصر واقعہ سے ہوگا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیان ہے کہ

"۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے ابّا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر سات سال

کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انھیں ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لیے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے لیکن میرا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شانِ نزول کا باعث ضرور بنا۔[1]

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

نئی نسل کے متعلق اقبال کے خیالات اور اس کے لیے دُعائیں وغیرہ کے سلسلے میں اس واقعہ سے روشن تر واقعات بھی موجود ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ کی مشہور فارسی تصنیف "جاوید نامہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں منظرِ عام پر آیا جبکہ جاوید اقبال کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ یعنی اگر "جاوید نامہ" فارسی کی بجائے اردو میں ہوتا تب بھی جاوید کے لیے اس کا پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے فارسی کے اس مجموعۂ کلام کا نام جاوید کی نسبت سے "جاوید نامہ" رکھا۔ اس مجموعۂ کلام میں آخر میں

---

[1] اقبال سب کے لیے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔

"خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے ایک طویل دعائیہ نظم بھی شامل کی ہے۔ اس نظم کا مخاطبہ جاوید سے ہے اور یقیناً علامہ اقبال یہ بھی جانتے تھے کہ ان کا فرزند اس نظم کے مطالب سے بے نیاز نہ رہے گا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد اس کو پڑھے گا، دوسروں کو سمجھائے گا اور اپنے فکر و عمل کا جُز بنائے گا۔ لیکن یہاں جاوید کا نام محض علامت یا مثال کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ حقیقت میں اقبال کا تخاطب اس نظم میں جاوید کے حوالے سے پوری نژادِ نو ہے۔ "خطابِ جاوید" کے نیچے قوسین میں "سخنے بہ نژادِ نو" درج ہے۔

ان دونوں نظموں کو اقبال نے بچّوں کی نظموں میں شامل نہیں کیا ہے۔ چونکہ جاوید کے پردہ میں اقبال نے نئی نسل کے لیے نصیحت کی ہے۔ نئی نسل مستقبل کی قوم کی معمار ہوگی اس لیے یہ نظمیں ان نصیحت اور سبق آموز نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے تخیلی ارتقاء کے لحاظ سے اقبال کی شاعری کے چار ادوار قائم کیے ہیں۔ پہلا دور ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک، دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک، تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء اور چوتھا دور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک۔ پروفیسر فاروقی فرماتے ہیں۔

"اقبال پہلے دور میں حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ مناظرِ

قدرت اور مظاہراتِ فطرت کے مشاہدے سے وہ رازہائے سربستہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پہاڑ، باغ، سورج، چاند، ابر، پھول اور شمع ہر چیز کو وہ اپنا مخاطب بناتا ہے اور طرح طرح کے سوالات کرتا ہے۔ اس دور میں اقبال معلمِ اخلاق بھی نظر آتا ہے۔ وطنیت اور ہندو مسلم اتحاد کے بھی گن گاتا ہے۔ کہیں کہیں حکمت و فلسفہ اور تصوّرات کے رموز و نکات سے بھی کام لیتا ہے اور بعض نظموں، خصوصاً بچّوں سے متعلق نظموں میں انگریزی شعراء سے بھی اخذ و استفادہ کرتا ہے[1]۔"

اقبال کی ۱۹۰۵ء تک پہلے دور والی نظموں کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت مناظرِ فطرت کی عکّاسی اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشاری ہے۔ اس دور کی نظموں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کی تہہ میں علاّمہ کے فلسفۂ خودی کے بعض اجزاء کلبلاتے نظر آتے ہیں۔ خودی کے اجزاء میں انسان کی فضیلت، اس کی مخفی روحانی قوت، عقل و عشق، معرکۂ خیر و شر اور حیاتِ جاودانی کی آرزومندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اجزاء منظم و مربوط صورت میں تو بہت بعد کو منظرِ عام پر آئے۔ لیکن منتشر صورت

---

[1] اقبال سب کے لیے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ہیں۔ ان اجزاء کو اس دور کی بچّوں کی نظموں میں خصوصاً "پرندہ اور جگنو" میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال کے خیال میں وطنیت کا تصوّر صرف اس حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ افغانی، ایرانی، روسی، مصری، عراقی وغیرہ ہونے کی حیثیت میں ہر فرد کو اپنے وطن سے محبت ہونی چاہیئے اور ضرورت پڑنے پر اس کے لیے قربانیوں سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن وطنیت یا قومیت کے جوش میں امن پسند اور صلح جو قوموں کی طرف جارحانہ اقدام یا ایک قوم کو دوسری قوم پر حملے کی ترغیب کسی طرح بھی دنیا کو فلاح کا راستہ نہیں دکھا سکتی۔ جغرافیائی حدود اور مسلمانوں کے تحت اقبال نے لکھا ہے کہ

"یورپئین مصنفین کی تحریروں کے ذریعہ مجھے یہ بات ابتدا ہی میں اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر براعظم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں[1]"

---

[1] اقبال سب کے لیے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اقبال فکرِ سخن کے ابتدائی دور میں فارسی اور اردو فارسی کے زیرِ اثر اس خیال سے متفق نظر آتے ہیں کہ قدرتی مناظر یا فطرت کا حُسن قائم بالذات اور تحسین کے لائق ہے۔ یہی وہ حُسن ہے جسے حُسنِ ازل کہا جاتا ہے اور حُسن سے روحانی ہم آہنگی پیدا کر کے خود کو اس میں گم کر دینا کمالِ انسانیت ہے۔ بچّوں کی نظموں میں مثال کے طور پر نظم "جگنو" لی جا سکتی ہے۔

فن یا آرٹ کے متعلق اقبال کی رائے یہ ہے کہ اسے بہر طور بامقصد ہونا چاہیئے۔ بامقصد سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں معاون و مددگار ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کا سوز و ساز قوت کا مظہر خودی کا محافظ اور زندگی کا نقیب ہو۔ ادب برائے ادب کے نظریہ کے لیے اقبال کے تصوّرِ فن میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ کو تفننِ طبع یا محض دل بہلانے کا مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کی تعمیر، تطہیر اور تزئین کا نہایت ہی موثر اور معتبر وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں "شاعری" انسان کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بلکہ ایسا آلہ ہے جو کارزارِ حیات میں علم و حکمت سے زیادہ کارگر ہے۔ شاعری کو فلسفہ پر ترجیح دینے کی وجہ ممکن ہے اقبال ہی کے لفظوں میں یہ ہو کہ

"فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے۔ شاعری تجدید شباب کرتی ہے"[1]

---

[1] شذراتِ فکرِ اقبال۔ مترجم: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔

ایک اور جگہ شاعری کی اہمیت یوں بیان کی ہے کہ

"سائنس، فلسفہ، مذہب ان سب کی حدیں معیّن ہیں صرف فن ہی لامحدود ہے۔"[1]

سرسید احمد خاں کی تحریک نے ایک طرف زندگی اور معاشرے میں اصلاح و انقلاب کی صورت پیدا کی۔ دوسری طرف اس تحریک کے زیرِ سایہ شعر و ادب کی محفلوں میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔ حالؔی، شبلؔی، نذیرؔ احمد اور آزادؔ نے شعر و ادب میں ایک نیا بانکپن پیدا کیا۔ فطرت نگاری نے ادب کو سیدھے سادے قریبی تجربات سے روشناس کیا۔ اسمٰعیلؔ میرٹھی وغیرہ نے ان کی ہمنوائی کی۔ اقبال نے اس تحریک سے متاثر ہو کر جذبۂ فطرت کا اظہار کیا۔ مناظر و مظاہر کو پسِ منظر کے طور پر پیش کیا۔ انسان کے منصب و مقام کے تعین میں اقبال نے فطرت کو ایک شاہد تسلیم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف فطرت سے انسانی عظمت و رفعت کا احساس پیدا کرتے ہیں دوسری جانب اس حقیقت کا اعتراف بھی ملتا ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو میں فطرت انسان کی عظمت و رفعت کے آگے سرنگوں ہے۔ عالم فطرت کی تمام نیرنگیاں صرف انسان کے تصرفات

---

[1] شذراتِ فکرِ اقبال۔ مترجم، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

کے لیے پردۂ وجود پر لائی گئی ہیں ورنہ ان کا کوئی خارجی وجود ماورائے انسان نہیں ہے۔

اقبال کے بچّوں کے کلام میں جو چیز قابلِ ذکر ہے وہ اقبال کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ اقبال کی فکر و نظر بلند اخلاقی قدروں کی طرف مائل ہے۔ ماخوذ نظموں میں فطرت کے بے شمار مناظر و مظاہر کا تذکرہ کر کے ان سے اخلاقی حکایتیں سنائی جاتی ہیں۔ سماج میں بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جس صالح ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر اقبال نے اخلاقی نظموں کو پیش کر کے ذہن کی پختگی اور فکر کی بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔

۲۔ بچّوں کے لیے

اقبال نے اپنے کلام میں فرد اور قوم کے تعلق پر خاص زور دیا ہے۔ فرد کو قطرہ اور قوم کو دریا سے تشبیہہ دے کر انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک قوم میں دریا کے مانند وسعت ہو لیکن یہ وسعت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ اس قومیت کی بنیاد ملک، نسب، رنگ روپ پر نہیں بلکہ روحانی اصول پر جو آفاقی اور عالمی حیثیت رکھتے ہیں، رکھی جائے۔ کل کی اس قوم کے معیار آج کے بچّے ہیں۔ مستقبل کے ملک و قوم کی ذمہ داریاں یہی بچّے سنبھالیں گے۔ اقبال نے کئی موقعوں پر اس کا اظہار کیا ہے کہ

"اگر بچّوں کی تربیت میں خامی رہ جائے تو تعمیر قوم و وطن کی بنیاد میں خامی رہ جائے گی"[1]

قوم کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال نے بچّوں کی

---

[1] بچّوں کا اقبال۔ جگن ناتھ آزاد۔

تعلیم و تربیت کے متعلق بڑے اہم مضامین لکھے جو ان کے زمانے میں ملک کے بڑے بڑے رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔ نئی نسل سے اقبال کے گہرے تعلق کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بچّوں اور نوعمروں کے لیے کہی ہیں۔ یہ نظمیں گویا اس پیغام کی تمہید ہیں جو اقبال نئی نسل کو آئندہ دینا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لیے قریب قریب وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر کوئی شخص اپنی خودی کو استوار و مستحکم بنا سکتا ہے۔

کلیاتِ اقبال (صدی ایڈیشن ۱۹۸۲ء) میں علّامہ کے چار مجموعہ کلام شامل ہیں۔

۱۔ بانگِ درا

۲۔ بالِ جبریل

۳۔ ضربِ کلیم

۴۔ ارمغانِ حجاز

بانگِ درا میں ۹ نظمیں بچّوں کے لیے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ایک مکڑا اور مکھّی، ۲۔ ایک پہاڑ اور گلہری، ۳۔ ایک گائے اور بکری، ۴۔ بچّے کی دعا، ۵۔ ہمدردی، ۶۔ ماں کا

خواب ، ۷ ۔ پرندے کی فریاد ، ۸ ۔ ترانۂ ہندی ، ۹ ۔ ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت ۔

ان نَو نظموں کے علاوہ مزید دو نظمیں " ایک پرندہ اور جگنو" اور " جگنو" بھی جو بانگ درا میں شامل ہیں بچّوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں میں شمار کی جاسکتی ہیں ۔ ان گیارہ نظموں کے کل ۱۵۲ شعر ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فقیر سیّد وحید الدین (مرحوم) سے علاّمہ اقبال کی بعض غیر مطبوعہ نظمیں حاصل کرنے اور ۱۹۶۲ء میں کراچی میں فقیر صاحب (مرحوم) سے ملاقات کے موقع پر علاّمہ اقبال کے غیر مطبوعہ کلام کا ایک بیش بہا خزانہ ملاحظہ کرنے کے بعد ۱۹۷۷ء "بچّوں کا اقبال" نامی کتاب " الجمیعتہ پریس دہلی" سے شائع فرمائی ۔ اس میں آزاد صاحب نے علاّمہ اقبال کی بچّوں کے لیے کہی ہوئی مذکورہ بالا نَو نظموں کے علاوہ مندرجہ ذیل چھے غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل کی ہیں ۔

۱ ۔ شہد کی مکھّی ، ۲ ۔ ننھّی سی ایک بوند ، ۳ ۔ محنت ، ۴ ۔ گھوڑوں کی مجلس ، ۵ ۔ چاند اور شاعر ، ۶ ۔ چند نصیحتیں ۔

اور ان مطبوعہ و غیر مطبوعہ جملہ پندرہ نظموں کے کل ۳۳۴ شعر " بچّوں کا اقبال" میں ملتے ہیں ۔

نیز پروفیسر آزاد نے " بانگ درا" کی مذکورہ نَو مطبوعہ نظموں

میں علّامہ اقبال نے جتنے اشعار حذف کیے تھے "بچّوں کا اقبال" میں شامل کرکے شائع فرمایا جس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ایک مکڑا اور مکھّی ۔ ۲۴ مطبوعہ شعر، ۸ غیر مطبوعہ ۔ جملہ ۳۲ شعر

۲۔ ایک پہاڑ اور گلہری ۔ ۱۲ مطبوعہ شعر، ۱۲ غیر مطبوعہ ۔ جملہ ۲۴ شعر

۳۔ ایک گائے اور بکری ۔ ۲۹ مطبوعہ شعر، ۱۲ غیر مطبوعہ ۔ جملہ ۴۱ شعر

۴۔ بچّے کی دُعا ۔ ۲ بند، ۶ شعر مطبوعہ ۔ ۴ غیر مطبوعہ ۔ جملہ ۲۴ شعر

۵ ۔ ہمدردی ۔ ۸ مطبوعہ ۔ ۸ غیر مطبوعہ ۔ جملہ ۱۶ شعر

۶ ۔ ماں کا خواب ۔ ۱۵ مطبوعہ شعر ۔ ۹ غیر مطبوعہ ۔ جملہ ۲۴ شعر

۷۔ پرندے کی فریاد ۔ ۱۱ مطبوعہ شعر

۸۔ ترانۂ ہندی ۔ ۹ مطبوعہ شعر

۹۔ ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت ۔ ۴ بند، ۸ شعر مطبوعہ

غیر مطبوعہ چھے نظمیں جو "بچّوں کا اقبال" میں شامل ہیں اُن کے اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ شہد کی مکھّی ۔ ۲۴ شعر

۲۔ ننھّی سی ایک بوند ۔ ۳۱ شعر

۳۔ محنت ۔ ۲۱ شعر

۴۔ گھوڑوں کی مجلس ۳۹ شعر

۵۔ چاند اور شاعر۔ ۲۴ شعر

۶۔ چند نصیحتیں ۔ ۲۰ شعر

جناب فقیر سید وحیدالدین صاحب نے علاّمہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی بیاض کی مدد سے اپنی کتاب "روزگارِ فقیر" کی دوسری جلد میں علاّمہ کی جو نظمیں شامل کی ہیں اس سے استفادہ کرتے ہوئے "مکتبہ پیام تعلیم" سے اپریل ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر اطہر پرویز نے "بچّوں کے اقبال" نامی کتاب شائع کی۔ جس میں بشمول "ایک پرندہ اور جگنو" اور "جگنو" سترہ نظمیں مرتب کی ہیں۔ اشعار کی تعداد وہی ہے جو جگن ناتھ آزاد صاحب کی مرتب شدہ "بچّوں کا اقبال" کی ہے۔ البتہ ڈاکٹر اطہر پرویز نے (بچّوں کے اقبال) نظم "جگنو" میں بارہواں شعر حذف کر دیا ہے۔ اس طرح "بچّوں کے اقبال" میں شامل علاّمہ کی سترہ نظموں کے اشعار کی تعداد ۳۶۳ ہے۔

پروفیسر آزاد نے بھی ۱۵ نظموں کے ۳۳۴ شعر "بچّوں کا اقبال" میں شامل کیے ہیں اور اطہر پرویز نے بھی "بچّوں کے اقبال" میں ۱۵ نظموں کے ۳۳۴ اشعار ہی شامل کیے ہیں جن کے ساتھ "ایک پرندہ اور جگنو" کے ۱۲ شعر اور جگنو کے ۱۷ شعر مل کر جملہ تعدادِ اشعار ۳۶۳ بنتی ہے۔

عبدالقوی دسنوی نے اپنی تصنیف "بچّوں کا اقبال" میں

"کلیاتِ اقبال"، مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق سے جو نظمیں ترتیب دی ہیں ان میں اشعار کی تعداد حسب ذیل ہے:

۱۔ ایک مکڑا اور مکھی	۲۳ شعر
۲۔ ایک پہاڑ اور گلہری	۱۲ شعر
۳۔ ایک گائے اور بکری	۲۹ شعر
۴۔ بچّے کی دُعا	۲ بند، ۶ شعر
۵۔ ہمدردی	۸ شعر
۶۔ ماں کا خواب	۱۵ شعر
۷۔ پرندے کی فریاد	۲۰ شعر
۸۔ ترانۂ ہندی	۹ شعر
۹۔ ہندوستانی بچّوں کا گیت۔ ۵ بند، ۱۰ شعر	
۱۰۔ ایک پرندہ اور جگنو	۱۲ شعر
۱۱۔ جگنو	۱۹ شعر

کُل ۱۶۳ اشعار

کُلیاتِ اقبال"، صدی ایڈیشن، جسے علّامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال کی ترتیب اور علّامہ اقبال کے دیرینہ رفیق مولانا غلام رسول مہر

کی تصحیح کے ساتھ "ایجوکیشنل بک ہاؤس"، علی گڑھ نے شائع کیا ہے، ان گیارہ نظموں کے اشعار کی تعداد ۱۵۲ ہے (تفصیلات اس مقالہ کے صفحہ نمبر ۱۸۳ سے ۱۸۶ تک دی گئی ہیں) اور عبدالقوی دسنوی کی تصنیف "بچّوں کا اقبال" میں ان گیارہ نظموں کے اشعار کی تعداد ۱۶۳ ہے۔

کلیاتِ اقبال (صدی ایڈیشن)، بانگ درا میں شامل ان گیارہ نظموں کے علاوہ "بالِ جبرئیل" میں دو نظمیں "جاوید کے نام" ہیں جس میں جاوید کے پردے میں علاّمہ اقبال قوم کے نوجوانوں سے ہم کلام ہیں۔

"ضربِ کلیم" میں تین نظمیں "جاوید سے" کے عنوان سے ہیں۔ ان نظموں میں علاّمہ جاوید کے پردے میں قوم کے نوجوانوں سے ہم کلام ہیں۔

بچّوں کے لیے کہی ہوئی ان سترہ نظموں میں (گیارہ مطبوعہ اور چھ غیر مطبوعہ) درج ذیل سات نظموں کے عنوانوں کے نیچے قوسین میں "بچّوں کے لیے" لکھا ہوا ہے۔

۱۔ ایک مکڑا اور مکھی (بچّوں کے لیے)

۲۔ ایک پہاڑ اور گلہری (بچّوں کے لیے)

۳۔ ایک گائے اور بکری (بچّوں کے لیے)

۴ - بچّے کی دُعا (بچّوں کے لیے)

۵ - ہمدردی (بچّوں کے لیے)

۶ - ماں کا خواب (بچّوں کے لیے)

۷ - پرندے کی فریاد (بچّوں کے لیے)

ان نظموں کی یعنی بچّوں کے لیے کہی ہوئی گیارہ نظموں کی مرکزی خیال کے اعتبار سے حسبِ ذیل تقسیم ہوسکتی ہے۔

" ایک مکڑا اور مکھی" اس نظم کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد اور چاپلوسی میں آنا گویا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

" ایک پہاڑ اور گلہری" اس نظم کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقی بڑائی کا تعلق قد و قامت سے نہیں بلکہ حرکت و عمل سے ہے۔

" ایک گائے اور بکری" اس نظم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا وجود ساری مخلوق کے لیے باعثِ رحمت ہے۔

" بچّے کی دُعا " تعمیرِ سیرت کے سلسلے میں کسی تعارف کی محتاج نہیں - اس میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔

" ہمدردی " صرف یہی نہیں کہ ہمدردی کا درس دیتی ہے

بلکہ ظلمت کو روشنی اور بدی کو نیکی میں بدل
دینے کا عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔

"ماں کا خواب" ان نظموں میں سے ہے جن کا مقصد غیر ضروری
سہارے اور حد سے بڑھی ہوئی دنیاوی محبت
کو فرد کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ظاہر کرنا ہے۔

"پرندے کی فریاد" علامتی انداز میں غلامی سے بیزاری اور آزادی
سے والہانہ لگاؤ کا اظہار ہے۔

"ترانۂ ہندی" اور

"ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت" دونوں نظمیں حب الوطنی کا پتہ دیتی ہیں۔

"ترانۂ ہندی" کو غیر منقسم ہندوستان میں سب
سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی
اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ یہ نظم جو
پہلے پہل "ہمارا دیس" کے عنوان سے شائع
ہوئی اور اس ترانہ کو ملک بھر میں جو مقبولیت
حاصل ہوئی اس کا اندازہ پاکستان کے فلسفی
مصنّف خلیفہ عبدالحکیم کے اس بیان سے ہوتا ہے
"اقبال نے اپنے شاعرانہ کمال کو وطنیت کے لیے

وقف کیا تو مسلمان بلکہ اس سے زیادہ ہندو
اس سے متاثر ہوئے ' سارے جہاں سے اچھا
ہندوستاں ہمارا' ملک کے طول و عرض میں
گونجنے لگا ۔ بعض ہندو مدارس میں بھی مدرسہ
شروع ہونے سے پہلے طالب علم اسے کورس کی
شکل میں گاتے۔"[1]

"ترانۂ ہندی" کے شیدائیوں میں گاندھی جی بھی
تھے ۔" حصولِ آزادی کے ایک ہفتہ بعد ۲۱ اگست
۱۹۴۷ء کو نواکھالی (موجودہ بنگلا دیش میں)
کے ایک گاؤں میں جہاں اس وقت پاکستان و
ہندوستان دونوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے'
گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا سبھا میں " ترانۂ
ہندی" کا مصرعہ

' مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'

دہراتے ہوئے دُعا کی کہ اپنے مسائل کو حل کرنے

---

[1] فکرِ خیال ۔ پاکستان ایڈیشن ۔ صفحہ ۴۶ ۔

کے لیے ہندوستان و پاکستان کبھی تلوار نہ اٹھائیں۔

" ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت" میں علاّمہ نے سرزمین ہند کے تقدس کو ظاہر کیا ہے۔

" جگنو " خدا کے جلوے کا ذکر ہے۔ مظاہر فطرت کا اختلاف باہمی ہنگاموں کا سبب نہیں ہونا چاہیئے، انسانوں کو ایک دوسرے سے دشمنی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ ہر انسان میں اُسی کا (خُدا کا) جلوہ پوشیدہ ہے، کا درس دیتی ہے۔

"ایک پرندہ اور جگنو" میں کائنات کے وہ دونوں پہلو ہیں جن کی ہم آہنگی سے دنیا کی دلکشی اور انسان میں ترقی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

غیر مطبوعہ نظموں میں نظم "شہد کی مکھّی" میں خدا کی پیدا کردہ نعمتوں سے خود مستفیض ہونا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا سبق دیا گیا ہے۔ اس میں بچّوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ

لہ ماہنامہ "آج کل"۔ فروری ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۸

جس طرح شہد کی مکھّی پھولوں پر اس کی خاطر
منڈلاتی ہے اسی طرح علم حاصل کرنے کے لیے کتابوں
پر منڈلاتے رہو۔

"ننھّی سی ایک بوند" میں غریب اور مجبور و مستحق انسانوں کے ساتھ
ہمدردی سے پیش آنے کا سبق دیا گیا ہے نیز
نیکی کی راہ میں کبھی ہمت نہ ہارنے کی تلقین ہے۔

"چاند اور شاعر" میں ظاہر کیا گیا ہے کہ علم و ہنر کے گھٹنے کا خطرہ نہیں
بلکہ اس میں منزل بہ منزل اضافے کی گنجائش
ہے۔ انسان کو ہر دم کمال کی فکر ہونی چاہیئے۔
تعلیمات کے ساتھ عمل پر زور دیا گیا ہے۔

"محنت" میں واضح کیا گیا ہے کہ محنت ایک ایسا سونا ہے
جس کے چوری ہونے کا خوف نہیں۔ غریبی کے
دُکھ کی دوا، عزت، شان و شوکت، اندھیرے
گھروں میں اُجالا غرض کا زمانۂ عالم کا سارا دارو
مدار محنت ہی پر ہے۔

"گھوڑوں کی مجلس" میں بتایا گیا ہے کہ ناتجربہ کاری کے سبب
دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانا مناسب نہیں ہے۔

بہتر ہے کہ سوچ سمجھ سے کام لیں اور بڑوں سے
صلاح ومشورہ کریں۔

"چند نصیحتیں" اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ کٹھن منزل کا حاصل کرنا اور مشکلات پر قابو پانا مشکل ضرور ہے مگر ناممکنات میں سے نہیں۔ اس نظم میں بچّوں کی خواہشات، کامیابی، تندرستی، اخلاقی فرمانبرداری کتابوں کی حفاظت، عملی طور پر ان تمام خوبیوں کی تلقین کی ہے۔ خاندانی بڑائی پر اِترانا، آپس میں ایک دوسرے سے نفرت کرنا، جانداروں کو تکلیف دینا وغیرہ قسم کی برائیوں سے باز رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ان نظموں کے علاوہ "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" میں "جاوید کے نام" اور "جاوید سے" کے عنوانات پر نظمیں ملتی ہیں۔ اقبال کو نئی نسل سے یہ شکایت ہے کہ وہ تن آسان، بے عمل اور بے قوت ہوتی جا رہی ہے۔ مغرب پرستی کا رجحان اس قدر غالب آگیا ہے کہ اپنی چیزوں کی قدر و قیمت اس کی نظروں سے گر گئی ہے اور غیر کی ہر چیز محترم و مرغوب بنتی جا رہی ہے۔ اقبال نے اپنے فرزند کو حقائق و معارف سے آگاہ کیا ہے

نصائح بھی کیے ہیں اور دُعائیں بھی دی ہیں۔

اقبال کے بچّوں کے کلام میں جو چیز قابلِ ذکر ہے وہ اقبال کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ اقبال کی فکر و نظر بلند اخلاقی قدروں کی حامل ہے۔ ماخوذ نظموں میں فطرت کے بے شمار مناظر و مظاہر کا تذکرہ کرکے ان کے ذریعے اخلاقی حکایتیں سنائی گئی ہیں۔ سماج میں بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جس صالح ماحول کی ضرورت ہے اس کے پیشِ نظر اقبال نے اخلاقی نظموں کو پیش کرکے ذہن کی پختگی اور فکر کی بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔

اقبال کی بچّوں کے لیے کہی ہوئی نظموں میں غیر مطبوعہ نظموں کے متعلق جو "بانگ درا" میں شامل نہیں ہیں، پروفیسر جگن ناتھ آزاد فرماتے ہیں:

> "غیر مطبوعہ کلام سے میری مُراد یہ ہے کہ یہ اقبال کے اپنے مرتب کیے ہوئے مجموعوں میں شامل نہیں لیکن ہوسکتا ہے جب اقبال نے یہ نظمیں کہی ہوں تو اس زمانے میں کسی رسالے یا اخبار میں شائع ہوئی ہوں[1]"

---

[1] "بچّوں کا اقبال" مرتبہ۔ جگن ناتھ آزاد۔

مطبوعہ نظمیں جو "بانگِ درا" میں شامل ہیں اور جن نظموں کے اشعار حذف کر دیئے ہیں، ان کے متعلق پروفیسر آزاد فرماتے:

"اکثر نظمیں 'بانگِ درا' میں مختصر صورت میں چھپی ہیں۔ جب اقبال نے یہ نظمیں کہی تھیں تو ان میں اشعار کی تعداد زیادہ تھی۔ درسی کتب میں بھی جب یہ نظمیں چھپی تھیں تو زیادہ اشعار کے ساتھ چھپی تھیں[1]"

غیر مطبوعہ نظموں کے بارے میں ڈاکٹر اظہر پرویز فرماتے ہیں:

"جناب فقیر سیّد وحید الدین نے علاّمہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی بیاض سے اپنی کتاب 'روزگارِ فقیر' کی دوسری جلد میں یہ نظمیں نقل کی ہیں جن کو کسی وجہ سے علاّمہ اقبال نے اپنی مطبوعات میں شامل نہیں کیا تھا۔ دراصل یہ اُن کی بلندیٔ ذوقِ نظر کی بات ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ نظمیں بچّوں کے ادب میں نمایاں حیثیت نہ حاصل کریں[2]"

---

[1] بچّوں کا اقبال۔ مرتبہ: پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔

[2] بچّوں کے اقبال۔ مرتبہ: ڈاکٹر اظہر پرویز

پانچواں باب

بچّوں کے ادب کا مطالعہ

جب ہم اقبال کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے جانے پہچانے شعرا کے کلام سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کا کلام ہمارے شعور و احساس، قلب و وجدان اور اعصاب میں حرکت و حرارت، سوز و گداز، درد و تپش پیدا کرتا ہے اور پھر ایک ایسا شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادّیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں۔ فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقت ور ایمان، پُر درد و پُر سوز سینہ اور بے چین روح رکھتا ہے۔ اقبال کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ بیک وقت ایک عظیم شاعر، ایک بلند پایہ مفکّر، ایک رمز شناس فلسفی، ایک وسیع النظر سیاست داں، ایک لائق مقنّن اور سب سے بڑھ کر خالص اسلامی شان کے ایک جلیل القدر انسان تھے۔ دنیا میں خال خال ایسی

شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جو اتنی گوناگوں خصوصیات کی حامل ہوں جیسے اقبال ۔ قدرت نے انھیں فکر و نظر اور احساس و جذبہ کی ایسی عجیب و غریب بلندیوں سے نوازا تھا کہ ہر شخص ان میں اپنے ذوق و شوق کی تسکین کا سامان تلاش کر سکتا تھا ۔ اپنے ذہن کی خوبی اور احساس کی قوت کے سبب انھوں نے علم و وجدان کی بہت اعلیٰ منزلیں طے کی تھیں ۔ مذہب ، فلسفہ ، ادب ، تاریخ سب پر ان کی گہری نظر تھی ۔ انھوں نے بہت کم مدّت میں کئی زبانوں پر دسترس حاصل کر لی تھی ۔ جرمنی جا کر جس تیزی سے انھوں نے جرمن زبان پر قدرت حاصل کی اس نے ان کے پروفیسروں کو حیرت میں ڈال دیا ۔ اپنے تعلیمی دور میں وہ ہمیشہ اپنے ہم جماعتوں سے ممتاز رہے انھوں نے جملہ امتحانات امتیاز سے پاس کیے ۔ یہ تمام باتیں اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ انھیں قدرت کی طرف سے بہت اعلیٰ ذہن عطا ہوا تھا ۔ خوش قسمتی سے انھیں استاد بھی ایسے ملے جنھوں نے بڑی شفقت اور تندہی سے ان کو تعلیم دی اور ان میں علم کا ایسا شوق پیدا کیا کہ آخر عمر تک اقبال علم کے شیدائی بنے رہے ۔ ان کے استادوں میں مولوی میر حسن شاہ اور ٹامس آرنلڈ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ۔ ان دونوں استادوں نے اُن کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں نمایاں حصّہ لیا ۔

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں ان اثرات کا بھی بڑا حصّہ ہے جو خود ان کے والدین نے اُن پر چھوڑے تھے۔ یہ دونوں بزرگ ہستیاں اپنی پاکیزگئی اخلاق، دینداری اور روشن ضمیری کے باعث لوگوں میں بہت محترم تھیں۔ والد پر تصوّف کا رنگ بہت گہرا تھا اور وہ ایک صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔

علم سے اقبال کی گہری دلچسپی، والدین اور استادوں کے فیضِ تربیت سے اخلاقی قدروں پر ان کا پختہ یقین، یہ دونوں اقبال کی شخصیت کے اہم عناصرِ ترکیبی تھے۔ اقبال کی شخصیت کا گداز اور ان کی طبعیت کا سوز و ساز ان کے جذبۂ محبت میں مضمر ہے جو ان کی رگ و پے میں جاری و ساری نظر آتا ہے تو کبھی ملک و قوم اور ملّت سے محبت کی شکل میں۔ لیکن جس کا بہترین اظہار اس والہانہ عشق کی صورت میں ملتا ہے جو انھیں اسلام، بانئ اسلام اور اکابرینِ اسلام سے تھا۔ جیسے جیسے اقبال اپنی عمر کی منزلیں طے کرتے گئے ان کے فکر و احساس کی قوتیں ایک ہی نقطۂ پر مرتکز ہوتی گئیں اور ان کا واحد مقصد مسلمانوں کے اندر اسلام کی تعلیمات عام کرنا بن گیا۔

اقبال کے خیال میں موجودہ نظامِ تعلیم اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا ہے اور وہ ایسی نسل کو تربیت نہیں دے سکا ہے جو اپنی معلومات سے فائدہ

اٹھاتی اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھتی بلکہ اس کے برعکس وہ افریقہ اور قطب شمالی کی نا معلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات و نباتات سے آگاہ ہے۔ لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے عرفان سے قطعاً غافل! برق و بخارات، ایٹمی و جوہری توانائی اور نیوکلیائی طاقت کا پتہ اس نے لگایا لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا ہے۔ دنیا کو مسخر کر لیا ہے لیکن خود پر قابو نہیں پا سکا۔ یہ سارا قصور نظامِ تعلیم کا ہے جس نے اس کا توازن غلط اور مزاج فاسد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"یہ عجیب بات ہے کہ شعاعِ شمسی کو گرفتار کرنے والا اپنا مقدر نہ چمکا سکا، نظامِ سیارگان کو جاننے والا کسی راہِ عمل پر نہیں پہنچ سکا اور سائنس کا محقق اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکا۔"[1]

مغرب و مشرق کے قدیم و جدید کے ٹکراؤ نے جب ایک واضح صورت اختیار کر لی اور مغرب کی تہذیبی قدروں نے یلغار کر کے مشرقی تمدّن کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا تو اس رگڑ یا تصادم سے زندگی کے نئے

---

[1] نقوشِ اقبال۔ مولوی شمس تبریز خاں۔

شرارے پھوٹے، اندھیرے میں روشنی کی کرنیں رونما ہوئیں اور شکستہ دلوں میں اپنے تحفظ و تشخص کا ایک نیا احساس بیدار ہوا۔ ہمہ وقت جذبوں سے کھیلنے کے بجائے عقل سے کام لینے کی اہمیت محسوس کی گئی اور ملک و ملّت کی تعمیر و اصلاح کے لیے ایک نیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اس بیداری اور اس لائحہ عمل کا اثر اردو شعراء پر وہی ہوا جس کی حسّاس طبیعتوں سے توقع کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ غالب کے فوراً بعد کی شاعری میں اس کے اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں اور اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی، سرور جہاں آبادی، محمد حسین آزاد، مولانا حالی وغیرہ ان ہی اثرات کے تحت جنم لینے والی شاعری کے نمائندے ہیں۔ البتہ زندگی کی اس قدامت اور پختہ کاری کے سبب جو کئی صدیوں سے ایک خطِ مستقیم پر قائم کی تھی اور جس کے تہذیبی عناصر میں شاعری کا عنصر سب سے قوی تھا آزاد اور حالی کی لائی ہوئی تبدیلیوں کا اثر عام آدمیوں پر ذرا دیر سے ہوا۔ عام طور پر روایتی غزل ہی چلتی رہی۔

یہ تھا وہ تہذیبی ماحول اور یہ تھی وہ شاعرانہ فضا جس میں اقبال نے آنکھ کھولی، ان کے ذوقِ شعری کی تربیت ہوئی اور ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ اقبال کے فکر و فن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی توجہ کیا ہے" سے زیادہ "کیا ہونا چاہیئے" پر مرکوز رہی ہے۔ حال سے

بیزاری اور جہانِ تازہ کی تخلیق کے ذریعہ خوش آئند مستقبل کی آرزو مندی و بشارت اُن کے فلسفۂ حیات کے ایسے موضوعات ہیں جن کا ذکر ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ "آج" سے زیادہ "کل" کے یا حال سے زیادہ مستقبل کے شاعر ہیں اور ان کا مخاطبہ بزرگوں اور ہم عمروں سے اتنا نہیں جتنا کہ نئی نسل سے ہے۔ اقبال کو یقین تھا کہ نوجوان ہی ان کے آرزوؤں کے چراغ اور امیدوں کے آفتاب و مہتاب ہیں۔ ان کی روشنی آج مدھم سہی، کل تیز ہو گی اور مستقبل کی شاہراہ اس روشنی سے جگمگا اُٹھے گی۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ان کا پیغامِ حیات ہی دراصل نئی نسل سے ان کے تعلق کو استوار کرتا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انقلاب کی کشمکش سے بھرپور زندگی قوموں کی بقا و ارتقاء کی ضمانت اور انقلاب سے محروم زندگی موت کا پیغام ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ انقلاب کسی وقتی ہیجان یا جذباتی طوفان کا نہیں بلکہ ندرتِ فکر و عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسی ندرتِ فکر و عمل جو اپنی دنیا آپ تخلیق کرتی ہے، اپنے طور پر سنوارتی، بناتی اور پروان چڑھاتی ہے۔ قوموں کا شباب اور سوز آرزو اسی ندرتِ فکر و عمل

سے عبارت ہے۔ یہ ذوق انقلاب یا ندرتِ فکر و عمل انسان کی فطرت میں
میں ہے۔ اس کی روح کو ٹھہراؤ یا ثبات میں نہیں بلکہ تغیّر و انقلاب میں
قرار ملتا ہے۔ یہ تغیّر و انقلاب زندگی کی دائمی صفت ہے۔ اس کی شکلیں
بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن روح کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اس کا دوسرا نام چراغِ
مصطفوی، نیکی اور یزدانیت ہے۔ یہ ندرتِ فکر و عمل یا ذوقِ انقلاب
جس کی کارکشائیوں کی ذکر اقبال کے یہاں بار بار آتا ہے ان کے اس
عقیدے کا جزو لاینفک ہے کہ زندگی جامد و ساکت نہیں، نامیاتی و حرکت
کی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے یہ زندگی قابو میں نہیں آتی
اس کی تسخیر کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہو جاتا
ہے کہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کی حفاظت و بقاء کے لیے سامنے کے
اقدار کش ماحول سے برسرِ پیکار رہا جائے۔ اس سے بیزاری کا اظہار
کر کے اس سے مُقاوِمَت و مُجادِلت کی قوت پیدا کی جائے۔ لوگوں
کو سود و زیاں کا احساس دلا کر اس کی سفاکیوں اور ہوسناکیوں
کے خلاف دلوں میں گرمی پیدا کی جائے اور ماحول کے مقابلے میں
شانِ استغنا اور بے خوفی و بے حرصی کے ساتھ ہمہ وقت حق کی تلوار
کو بلند رکھا جائے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے فلسفۂ حیات میں بنیادی حیثیت
قوتِ عمل ہی کو دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف طاقتور ہی اپنے ماحول

کی تخلیق کر سکتا ہے جبکہ کمزور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے پر مجبور رہتا ہے ۔ قوت میں یہ صفت ہے کہ وہ باطل کو چھو لیتی ہے تو باطل حق میں بدل جاتا ہے ۔

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

ظاہر ہے کہ اس تلوار کے دھنی اور اس کے متحمل و محافظ صرف نوجوان ہی ہو سکتے ہیں ۔ ایسے نوجوان جن کا لہو گرم ہو، جن کے بدن میں مدافعت کی قوت ہو، جن کی رگ و پے میں زندگی کا تازہ خون موجیں مار رہا ہو اور جن کے سینے جوشِ جوانی سے معمور ہوں ۔ جن کے دل زندہ اور روحیں عقابی ہوں ۔ جن میں جھپٹنے ، پلٹنے ، پلٹ کر جھپٹنے کا سلیقہ ہو ۔ جن کی ہمتِ مردانہ ستاروں پر کمندیں ڈال سکتی ہو، جن کا حوصلہ نخچیری یزداں شکار اور غیور جرار ہو، جن کے ہونٹوں پر موت کے سامنے ہنسی کھیل جاتی ہو، جن کی طبیعتیں خطر پسند اور جن کے ارادے بلند ہوں، جو فقرِ شبیری کو اپنا توشہ اور پہاڑوں کی چٹانوں کو اپنا نشیمن جانتے ہوں، جو اپنے اندر خود گری ۔ خود شکنی اور خود نگری کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جن کے زورِ بازو پر بھروسہ کر کے یہ کہا جا سکے ۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسم زمان و مکاں توڑ کر

اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ اقبال نے اپنے پیغامِ حیات یا فکر و فن میں بالعموم نژادِ نو یا نوجوانوں ہی کو مخاطب کیا ہے۔ یوں بھی اُن کا فلسفۂ خودی جس میں قوت اور عمل کو اساسی حیثیت حاصل ہے ان کی آخری عمر کا نہیں بلکہ عین عالمِ شباب کا تخلیق کردہ ہے۔

آج کا نوجوان معاشرہ اقبال کو فکر مند بھی بنا دیتا ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ نوجوانوں کی یہ کیفیت ہے کہ اُن کے لب تشنہ اور ان کے پیالے صہبائے شوق سے خالی ہیں۔ چہرے اور دماغ روشن، دل تاریک ہے۔ کم نگاہی، بے یقینی اور نا امیدی نے ان کی نظروں سے حقائق کو اوجھل کر دیا ہے، خود پر اعتماد کرنے کے بجائے غیر پر تکیہ کر رہے ہیں۔ حرم کی مٹی دیر کی تعمیر میں صرف ہو رہی ہے۔ درس گاہیں اپنے مقصد سے بیگانہ اور خود آگہی کی عظمت سے ناآشنا ہیں۔ ان کے فیض یافتہ نوجوان فطرت کے نور سے محروم اور شاخِ علم کے برگ و ثمر سے دور ہیں ان مدارس کے معماروں نے پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے۔ شاہین بچّوں کو بطخوں کے آداب سکھائے جا رہے ہیں۔ ان کے درس میں نہ زندگی کا نور ہے نہ وارداتِ قلب کی لذّت۔ ایسے ماحول میں سینکڑوں کتابوں کے بے جان مطالعے سے بہتر تو خود اپنے ہی ذوقِ نظر کا ایک درس ہے۔ دینِ فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی طلب کی آگ میں عمر بھر جلتا

رہے اور عشق کی ابتدا و انتہا یہ ہے کہ دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اقبال کا بیان ہے کہ

"جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آج کل کے نوجوان آدمیت کے باب میں گستاخ و بے ادب ہو رہے ہیں تو میرا دل کڑھتا ہے' سینے میں عجیب طرح کا پیچ و تاب پیدا ہوتا ہے۔ حضور کے اخلاقِ حسنہ کی یاد آ جاتی ہے اور ملّت کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ اے کاش نئی نسل، آدمی کے مقامِ محمود سے باخبر ہوتی اور احترامِ آدمی کو آدمیت کا حاصل جانتی"[1]

اس کے ساتھ ہی نئی نسل کو عہدِ حاضر کی پُر فریبیوں اور غلط اندیشوں سے متنبہ کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ دولت و سرمایہ کی حرص نے بڑے بڑوں کو فکر و بصیرت سے محروم کر دیا ہے۔ کثرت نعمت نے ان کے دلوں میں گداز و نیاز کے بجائے ایسا ناز و غرور پیدا کر دیا ہے کہ دردناک واقعات پر بھی مُنعِم کی آنکھ نم نہیں ہوتی۔

جاوید کو مخاطب کر کے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"تو جس عہد کا زائدہ و پروردہ ہے میں اس عہد سے

---

[1] اقبال سب کے لیے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

خوف کھاتا ہوں، اس میں ہر آدمی تن پروری میں غرق ہے اور روح کو نظرانداز کر رہا ہے۔ جسم کی اس ارزانی اور سوزِ دل کی نایابی کے سبب اہلِ حق گوشہ گیر ہو گئے ہیں لیکن میں تجھ سے یہ کہوں گا کہ خواہ راستے میں کیسی ہی دشواریاں پیش آئیں۔ ذوقِ طلب میں کمی نہ آنے پائے۔ اگر کسی صاحبِ بصیرت کی صحبت و رہنمائی نہ مل سکے تو اسلاف کا جو ورثہ میں چھوڑ رہا ہوں اس پر تکیہ کرنا، پیر رومی کی تعلیمات کو رفیق و رہنما بنانا تاکہ سوز و گدازِ قلب میسّر آئے۔[1]

اقبال فرماتے ہیں کہ بے عملی سے ساری شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ عمل سے وہ اپنی شخصیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اقبال کی کہی ہوئی بچّوں کی نظموں میں عملی طور پر کچھ کر دکھانے کا جوش اور ولولہ "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ماں کا خواب"، "ہمدردی"، ["محنت"، "چاند اور شاعر"، "چند نصیحتیں" (غیر مطبوعہ)] سے پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کی نظریں فطرت کا حسن و جمال اپنی ساری بوقلمونیوں

---

[1] اقبال سب کے لیے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری

کے باوجود بے جان، بے حرکت، بے اثر اور جامد ہے۔ اس لیے کہ چاند اور ستارے جس مخصوص اور متعین انداز میں ہزاروں، لاکھوں سال پہلے کام کر رہے تھے، اسی طرح آج بھی کر رہے ہیں۔ ان کے اندر اتنی سکت نہیں کہ وہ اس یک رنگی کی اکتاہٹ سے خود کو نجات دلا سکیں اور آدمِ خاکی کی طرح لحظہ بہ لحظہ تازہ کاری سے نت نئی دنیا آباد کر سکیں۔ اقبال اپنی ارتقائے ذہنی کے دور کی شاعری جسے یقین، خود اعتمادی اور خود نگری کا دور کہہ سکتے ہیں اور جس میں انھوں نے خودی و بے خودی یعنی اپنے فلسفۂ حیات کی تخلیق کی ہے۔ یہ فلسفۂ حیات در اصل قوت و عمل کا فلسفہ ہے۔ اقبال کے نزدیک قوت و عمل ہی زندگی کا اصل سرچشمہ ہیں اور انھیں کی تحصیل و تخلیقِ دینِ انسانی کے جملہ اکتسابات، کیا فلسفہ، کیا تصوّف، کیا فنون لطیفہ، سب کا اصل مقصود ہے۔ مشرق کی مجہول اور بے عمل زندگی جو زوالِ امّت کی اصل سبب بھی، اُن کے لیے الجھن کا سبب تو بھی ہی۔ مغرب میں بھی ان کو سکون میسر نہ آیا بلکہ وہاں کا مادہ پرست تمدن اور اخلاقی قدروں سے معرّیٰ معاشرہ ان کی روح کو اور بھی مضطرب کر گیا۔ چنانچہ دونوں پر ان کی تنقیدی نظریں پڑنے لگیں دونوں کے روّیوں کو وہ شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور دونوں سے مایوس ہو کر اپنی ذات کے خول

میں سمٹ جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش کا پرتو یورپ جانے سے پہلے مشرق کی بے دلانہ طرزِ زندگی سے یہ بھی ان کے یہاں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ اقبال کی شاعری کا وہ پہلو جسے شاعر کی ایسی دروں بینی اور داخلیت پسندی کا نام دے سکتے ہیں جو ماحضر و ماسبق سے کبھی کبھی بے اطمینانی اور کبھی بیزاری کا اظہار کرکے اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کی جستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے اور اس دروں بینی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے خوابوں اور آرزوؤں کے سلسلے لامحدود ہوتے ہیں۔ یہ ذوق و شوق، نِت نئے مقاصد کی تخلیق، منزلوں کی تلاش اور ان کے حصول کی جد و جہد میں سرگرم عمل رہتا ہے اور سکون کے مقابلہ میں حرکت کو، منزل کے مقابلہ میں سفر کو، تکمیل کے مقابلہ میں سعیِ تکمیل کو، آسانی کے مقابلہ میں دشواری کو اور بے عمل سلامتی کے مقابلہ میں خطرات کو، وصل کے مقابلہ میں ہجر کو، غیر کے سہارے کے مقابلہ میں اپنی قوتِ بازو کو ترجیح دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عمل کے لیے بچّوں اور بڑوں کو جو سبق دیا ہے اس پر خود بھی خلوصِ نیت کے ساتھ عمل کیا ہے اور یہ ان کے ساتھ خلوص کا نتیجہ ہے کہ ان کا فن، رنگ و نسل کے جغرافیائی دائروں تک محدود نہیں رہا بلکہ اپنے انفرادی جمال و جلال کے سبب آفاقی بن گیا ہے۔

مجہولیت کے خلاف جہاد کرنا اور ناتواں کی رگوں میں خون اور عمل کی برقی لہر دوڑانا ازبس ضروری تھا۔ ہرچند کہ اقبال سے پہلے اردو کے دو ممتاز شاعر حالؔی اور اکبرؔ اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو مرعوبی و مایوسی سے نجات دلانے اور ان میں خودداری و خوداعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ حالؔی پرسوز و پُردرد سنجیدہ لہجے میں اور اکبرؔ ظریفانہ پیرائے میں، لیکن بقول ڈاکٹر مجاہد حسین:

"ان دونوں بزرگوں کی نظر ابات کی تہہ تک نہ پہنچی انھوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخص کر لیا لیکن اس مرض کا سبب نہ پہچان سکے۔ اکبرؔ نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور حالؔی نے یہ کہا کہ وہ اجتہادِ فکر اور وسعتِ نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے۔ مگر دونوں میں کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر ان کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے اقبال کے فلسفیانہ نظریہ کی ضرورت تھی[1]"

---

[1] اقبال کے ابتدائی افکار۔ ڈاکٹر عبدالحق۔

چنانچہ اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کے زوال کا سبب یہ قرار دیا کہ وہ روحانی تعیش یا کاہلی و بے عملی کا شکار ہو گئی ہے۔ غیر اسلامی اثرات کا نتیجہ ہے جس نے اس کو خودداری اور قوتِ عمل سے محروم کر دیا ہے۔ اس محرومی کا علاج صرف یہ ہے کہ بے عملی کے اس فلسفے کو رد کیا جائے اور خودی کا احساس دلا کر اس میں سعی و عمل کی تازہ قوتیں پیدا کی جائیں۔

اقبال کی بچّوں کے لیے کہی ہوئی نظموں میں سیاسی بیداری، حب الوطنی، غلامی سے نجات حاصل کر کے آزادی سے لگاؤ کا ذوق، اتحّاد و اصلاح کا جذبہ اور باہمی ہنگاموں سے اختلاف پیدا کرنے والی نظموں میں "ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت"، "پرندے کی فریاد"، "ایک پرندہ اور جگنو" وغیرہ ہیں۔ اقبال نے غلامی اور آزادی کے موضوع پر نوجوانوں کو احساس دلا کر جگہ جگہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہیں آزاد اور محکوم کے اخلاق و اعمال کا فرق واضح کر کے نوجوانوں میں جوشِ حرّیت و حمیت پیدا کیا ہے۔ کہیں شاندار ماضی اور اسلاف کے کارناموں کے حوالے سے کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے پر اُبھارا ہے اور بے عملی پر غیرت دلائی ہے۔ کہیں نفسیاتِ غلامی پر روشنی ڈالی ہے اور کہیں نفسیاتِ حاکمی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ غرض طرح طرح سے یہ سمجھانے کی کوشش کی

ہے کہ نوجوانوں کے کردار و مستقبل کی تباہی میں محکومی یا غلامی کا بڑا ہاتھ ہے جب تک اس سے نجات نہیں ملے گی ملّت کے دن نہیں پھریں گے اور اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ افراد خصوصاً نوجوانوں میں غلامی کی زندگی سے نفرت پیدا ہو، ان کے جذبۂ خودداری و غیرت مندی کو جوش آئے اور وہ ہر قیمت پر محکومی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔

اقبال کے یہاں فرزند کہستانی یا نژادِ نو کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے "شاہین" بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اقبال نے شاعری میں اپنے مثالی نوجوان کو عموماً اسی نام سے پکارا ہے اس لیے کہ ایک نوجوان میں وہ جس قسم کے مردانہ اوصاف دیکھنے کے آرزومند ہیں وہ انھیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔ اقبال نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے کہ "شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خوددار و غیرت مند ہے۔ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیاں نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے، اور تیز نگاہ ہے۔ چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس ذکر سے ان کی مراد نوجوانوں ہی کی سیرت و کردار سے ہے۔ کیونکہ وہ خود اپنی پوری زندگی ایک

نہایت ذمہ دار شہری اور افراد کی حیثیت سے بسر کی ہے۔ انھوں نے شاگرد، استاد، بیٹا، دوست، عزیز، وکیل اور سیاسی کارکن کی حیثیت میں بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی کلامِ اقبال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں تعلیم کا مقصد تخلیقی ہے اور وہ مضمون قابلِ درس و تدریس ہے جو تخلیقی مقصد کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ سائنس کی تعلیم اس صورت میں پسندیدہ ہے اور ضروری ہے جب وہ تسخیر کائنات اور انسان کی بہتری کا وسیلہ بنتی ہے۔ لیکن جب سائنس جذبات و روح کو کچلنے کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اقبال کہتے ہیں۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

علاّمہ اقبال اس علم کے مداح اور داعی ہیں جو دین سے بیگانگی نہیں سکھاتا بلکہ خود دین کی حدود میں محفوظ و مامون رہتا ہے۔

نئی نسل سے اقبال کے گہرے تعلق کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بچّوں اور نوعمروں کے لیے کہی ہیں۔ تعمیرِ سیرت کے سلسلے میں "بچّے کی دُعا" کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بچّہ بارگہہ ایزادی میں اپنی معصوم تمنا لیے

ہوئے دست بدعا ہے۔ وہ کبھی شمع، کبھی آفتاب، کبھی خوشبو کبھی بُلبُل، پھول اور کبھی پروانہ بننے کی تمنا کرتا ہے۔ وہ دُعا کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے کسی جاندار کو تکلیف نہ پہنچے۔ ضعیفوں، دردمندوں اور غریبوں کی مدد کرنا اس کا شیوہ ہو۔ دکھ سے پریشان ہو کر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ ہو، بلکہ ہر حال میں شکر گزار ثابت ہو۔ ان تمام صفات کی تمنّا کرتے ہوئے دُعا کرتا ہے کہ خدا اسے کبھی گمراہ نہ کرے بلکہ صراطِ مستقیم پر چلائے جو قرآنی تعلیمات میں سے ہے۔

ہمدردی اور ایک دوسرے سے بھلائی چاہنے کا جذبہ نظم "ہمدردی" میں کارفرما ہے جو اپنے ساتھی کی بے بسی کے وقت پر خود کو روشن کر کے رات کی تاریکی کو دور کر کے منزلِ مقصود تک پہنچانا، دنیا اور آخرت میں نام روشن کرنا ہے۔

چاپلوسی اور خوشامد سے کسی کو بہلا پھسلا کر اپنی غرض پوری کرنا اور کسی کی زندگی کو ختم کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھانا ہے۔ اس طرح علاّمہ اقبال نے خود غرضی کو برا بتاتے ہوئے دوسروں کو اپنا شکار بنانے کے بجائے خودی کو اُجاگر کرتے ہوئے موت کو ترجیح دی ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی سے دوسروں کو پھانسنے سے گریز کا سبق "ایک مکڑا اور مکھّی" میں دیا گیا ہے۔

عملی زندگی پر ترجیح دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ قوت وعمل ہی زندگی کا اصل سرچشمہ ہے، قدوقامت نہیں۔ بچّوں کو یہ سبق "ایک پہاڑ اور گلہری" نظم کے ذریعہ دیا گیا ہے۔

انسان زمین پر خدا کا نائب ہے، انسان سے گلہ اور شکایت بے جا ہے۔ اس کا وجود ساری مخلوق کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ اپنی ناتجربہ کاری کے سبب دوسروں پر الزام عائد کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ سوچ سمجھ سے کام لیں۔ اس طرح کے سبق آموز واقعات نظم "ایک گائے اور بکری" اور نظم "گھوڑوں کی مجلس" میں پیش کیے گئے ہیں۔ (دونوں غیر مطبوعہ نظمیں ہیں)

حب الوطنی، آزادی سے لگاؤ، غلامی سے نفرت پیدا کرنے والی نظموں میں "ترانۂ ہندی"، "ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت" اور "پرندہ کی فریاد" میں یہ جذبات پیش کیے گئے ہیں۔

حد سے بڑھتی ہوئی دنیاوی محبت ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ ماں کا نیند کے عالم میں اپنے بچّے کو دیکھنا اور وہ بھی بجھا ہوا دِیا تھامے ہوئے سب کے پیچھے چلنا، پھر دِیا بتا کر ماں سے یہ شکایت کرنا کہ آپ کے آنسوؤں سے بجھی ہوئی مشعل مجھے بھلائی کی راہ نہیں دکھا سکتی۔ ابدی زندگی ہی سب کچھ ہے اور زندگی کا آغاز دراصل

یہیں سے شروع ہوتا ہے اور اس کے لیے رونا زندگی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے۔ یہ تمام باتیں نظم "ماں کا خواب" میں سمجھائی گئی ہیں۔

ہر شَے میں خدا کو تلاش کرنے والوں نے خدا کے حسن کو بھی پالیا۔ حسنِ ازل کی ارزانی اتنی عام ہوئی کہ مظاہرِ فطرت میں اس حسنِ ازل کی بوقلمونی نظر آنے لگی، ہر چیز حسنِ ازل کے نور سے منوّر دکھائی دینے لگی۔ اقبال کو بھی ہر چیز میں اس حسنِ ازل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ غرض اس حسنِ ازل کی ارزانی عام ہے۔ کائنات کی ننھّی منی اشیاء سے لے کر بڑی سے بڑی چیزیں اس حسن کا پرتو موجود ہے۔ ہر چیز حسین ہے۔ اسی وجہ سے عالمِ کائنات میں دلکشی اور رعنائی اپنے نقطۂ کمال کو ملتی ہے۔ علاّمہ اقبال نے یہ خیالات "جگنو" اور "ایک پرندہ اور جگنو" میں پیش کیے ہیں۔ طاقتور کو کبھی کمزور پر حاوی نہیں ہونا چاہئے۔ جگنو اور پرندہ کو خدا نے سوز اور ساز عطا فرمایا ہے۔ سوز اور ساز ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ دوست ہیں۔ انھیں دو پہلوؤں سے کائنات قائم ہے، مناظرِ فطرت کی مصوّری کے ساتھ ساتھ اتحاد و اصلاح کا جوش و جذبہ بھی موجود ہے۔

آیئے اب اقبال کی بچّوں کے لیے کہی ہوئی نظموں کا دوسرا رُخ بھی دیکھتے چلیں۔

اقبال نے بچّوں کے پردہ میں بڑوں کو بھی نصیحت کی ہے۔ اقبال کی وہ نظمیں جو بچّوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ ان میں بڑوں کے لیے بھی پیغام ہے۔ "بچّے کی دُعا" میں اقبال فرماتے ہیں کہ جب تک انسان خود کو نہیں سمجھتا خدا کو نہیں پہچانتا اور جب تک خدا کو نہیں پہچانتا وہ بچّہ ہی رہتا ہے۔ اقبال کی تمنّا ہے کہ انسان روح کو پہچانے۔ روح کی بیداری سے دنیا کا اندھیرا دور ہو جائے گا۔ میں میری زندگی غریبوں کے لیے وقف کر دوں اسی کو اپنی عبادت سمجھوں اور آخرت کی پونجی سمجھوں، بچّہ خود ایک خواہش ہے جو آخر تک سوچتا رہتا ہے۔ خدا جس سے محبت کرتا ہے اسے وہ فقیر بنا دیتا ہے۔ اگر خدا اپنے معزز بندوں کو نوازتا ہے تو وہ اس کے پیغام کو پھیلانے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ علاّمہ اقبال خدا کا پیغام پہنچا رہے ہیں اور وہ بھی بچّے کی خواہش کی مدد سے جیسے بچّے کی تمنّا ہوتی ہے۔

نظم "ہمدردی" میں اقبال کا پیغام یہ ہے کہ کائنات کے موجودات کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی ہستی کے موجودات کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ تمام راز جو خدا کی ہستی میں ہیں وہ انسان میں پوشیدہ ہیں۔ اقبال نے ٹہنی کو انسان کی ہستی کی ایک شاخ سے تشبیہہ دی ہے۔ جس پر ایک بُلبُل جسدِ خاکی ہے جس کی خاصیت ہمیشہ دنیاوی پریشانیوں میں مبتلا رہنا ہے۔ جب اس کی سانس قریب الختم ہوتی ہے تو اسے اس

وقت احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی بیکار گزار لی آخرت کی پونجی کو حاصل نہ کر سکا۔ یہی اداسی رات کی تاریکی معلوم ہوتی ہے۔ انسان کی روح بھی انسان میں پوشیدہ ہے جیسے رات کے اندھیرے میں جگنو۔ روح معمولی سا شعلہ ہونے کے باوجود زندگی سے مایوس ہستی کو راہِ راست پر لاتی ہے۔ خدا نے روح کو اسی روشنی سے آراستہ کیا ہے جس سے وہ ہستی کو صراطِ مستقیم پر لاتی ہے۔

نظم "ایک مکڑا اور مکھی" میں شاعر روح اور نفس کی گفتگو کو پیش کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ نفس اور روح میں مختصر سا فرق ہے۔ نفس اس خواہشات کو کہتے ہیں جو لاشعور سے بیدار ہوتے ہیں۔ اور روح وہ قوت ہے جو خدا کی صفات سے قوت پاتی ہے۔ جب روح انسانی خواہشات کی آواز سنتی ہے تو اپنی حقیقت کو جانتی ہوئی کہتی ہے کہ یہ دھوکہ کسی اور کو دینا کیونکہ نفسانی خواہشات میں کوئی پھنس جاتا ہے تو اس جال سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر خیال میں ایک پردہ ہے اور جب یہ پردے اٹھتے رہیں گے تو یہ راز کھل جائیں گے اور انسان خود بخود آئینہ معلوم ہو گا۔ انسان کا نفس ہمیشہ بھوکا رہتا ہے اور روح کو بڑے بے رحمانہ سلوک کے ساتھ کھا جاتا ہے۔

"نظم ایک پہاڑ اور گلہری" یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ

کی بنائی ہوئی ہر شے میں ایک قدرت پوشیدہ ہے اس لیے کسی چیز کو حقیر سمجھنا اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کے برابر ہے۔ گلہری کا مفہوم انسان کی ہستی سے لیا گیا ہے۔ انسانی ہستی کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اگر اس میں قلندرانہ شان آجائے تو وہ ساری کائنات پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہستی ذرّہ بھی بن سکتی ہے اور پربت بھی۔ ہر چیز میں خدا کی قدرت ہے۔ چھوٹا اور بڑا دراصل اس کی حکمت ہے۔

نظم "ایک گائے اور بکری" میں انسان کی عظمت پوشیدہ کو ظاہر کیا ہے۔ اچھائی اور برائی کے قانون خدا کے بنائے ہوئے ہیں انسانوں کا فعل حقیقت ہے۔ اس کے ہر فعل کو لازمی طور پر قبول کرنا پڑتا ہے اگر وہ آزاد کرتا تو آرام کے رات اور دن میسر نہ آتے۔

نظم "ماں کا خواب" میں انسان کے جسدِ خاکی کی حقیقت کو بتلایا گیا ہے۔ جب انسان نیند میں ہوتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر جاتی ہے تو اسے سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہیں آتا اور اندھیرے میں اس کا رواں، رواں کانپ جاتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ روح جسم سے دور ہے تو جسم میں قوت نہیں رہتی اس لیے ہاتھ کی مشعل بجھی ہوئی ہے اور وہ تیز نہیں چل سکتا۔ ساری زندگی مصیبتوں میں رو رو کر کاٹی ہے۔ اگر نہ روتی اور نفسانی خواہشات پر قابو پاتی اور

روح کو قریب لاتی تو آج اسی منزل کی طرف روانہ ہوتی جہاں رواں دواں ہیں۔

نظم "پرندے کی فریاد" میں یہ حقیقت ہے کہ روح جب جسم نہ تھی تو وہ آزاد تھی۔ جسم روح کو قید سا محسوس ہونے لگا۔ روح خدا کی نشانی اور خدا کی بھیجی ہوئی ہوتی ہے۔ انسان شکاری بن چکا ہے جو ہمیشہ گھات میں رہتا ہے۔ روح اس خوبصورت جسدِ خاکی کو دیکھ کر پھنس گئی ہے۔ انسان کی زندگی صحرا کے جانور کی طرح ہو گئی ہے جس میں اسے گلستان وغیرہ نظر نہیں آتے اس لیے گلشن کی سیر نہیں کر سکتا جو آخرت کی روشنی ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو دنیا کے لیے وقف کرتا ہے وہ نفس کی مانند ہے اور پرندہ کی نہیں بلکہ یہاں روح کی فریاد ہے،

جسم میں آنکھ کو جو مقام حاصل ہے شاعر کو اپنے معاشرے میں وہی بلند مقام ملا ہے۔ فن کار آنکھ کی طرح پورے جسم کا درد مند و غم گسار ہوتا ہے۔ فن کار دیدۂ بینا رکھتا ہے۔ اپنی بصیرت اور اپنے عرفان سے وہ معاشرے کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ یہ فن کا عظیم تصوّر ہے اور یہی فنکار کا بلند ترین منصب بھی ہے۔ یہیں سے شاعری میں جزوِ پیغمبری کا بھی تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنے محاسن شعری کو ایک عظیم مقصد کا پابند بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کو بطور فن کے پیش نہیں کرتے

بلکہ اس سے مقاصد آفرینی کا کام لیتے ہیں۔ یہ مقاصد زندگی سے متعلق ہیں جن میں اصلاح و عرفان بھی شامل ہے۔ فرد و جماعت کی اصلاح اور ان کے اندر صالح اقدار کی افزائش کے لیے شاعری کو پیغمبری کے مترادف سمجھتے ہیں فکر و نظر کے ابتدائی دور سے اس نقطۂ نظر کا آغاز ہوتا ہے اور اس سے رغبت ہر دور میں قائم رہتی ہے۔ اس رغبت میں ترقی اور گہرائی و گیرائی کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ فن صالح اقدار کا حامل ہے۔ یہ اقدار زندگی اور معاشرہ کے منفی رجحانات کا رد کرتے ہیں۔ مثبت اقدار زندگی کو پروان چڑھاتے ہیں۔ نئی روح اور نئی زندگی کے بیج بوتے ہیں۔ افکارِ تازہ کی پرورش کے لیے داخلی اور خارجی ماحول کو بھی سازگار بناتے ہیں۔ ان صالح اقدار سے اقبال ابتدا ہی سے روشناس ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کو جزوِ پیغمبری کہہ کر اس کے بلند مقاصد اور عظمت کا اقرار کرتے ہیں۔ یہیں سے ان کا فکر و فن دونوں نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فکر و فن کا نادر اور حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس امتزاج کا نقطۂ آغاز ابتدائی ادوار کی شاعری کے در و بست میں پیوست ہے۔

اقبال جس معاشرے میں پرورش پا رہے تھے وہ بے عمل بھی تھا اور بے تاج بھی، محکوم بھی تھا اور مظلوم بھی جب کوئی بامراد جواں بخت

قوم سرنگوں ہوتی ہے تو زندگی کی تمام تابناکیاں مغلوب ہو جاتی ہیں حیات کے جاں بخش امید افزا اقدار پامال ہوتے نظر آتے ہیں۔ ماضی کے اقدار داستانِ پارینہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس لیے اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو مفکر بھی ہو اور شاعر بھی اور قوم و ملّت کا سچّا غم خوار بھی۔ اردو زبان اور سرزمین پاک کو یہ فخر رہے گا کہ یہ عظیم المرتب شاعر جو اس کام کے اہل ثابت ہوا اور جس نے فی الواقع مِلّتِ اسلامیہ کو جینے کا از سرِ نو حوصلہ عطا کیا، اقبال کے نام سے ان کے حصّے میں آیا اور اپنے اظہارِ خیال کے ذریعے مریضانہ خیالات اور منفیانہ تصوّرِ عشق کے مقابلے میں زندگی اور عشق کا ایک ایسا ولولہ انگیز تصوّر پیش کیا کہ بقول شخصے اس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے پھوٹ پڑے، ایسے چشمے جن سے سیراب ہو کر مایوس دلوں کی خشک بنجر زمین میں جان پڑ گئی اور امید کی کھیتی لہلہا اٹھی۔ سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی۔ دلِ مردہ دوبارہ زندہ ہو گیا اور اُمّت کو مرضِ کہن سے نجات مل گئی۔ مرضِ کہن سے نجات ملنی تھی کہ وہی قوم جو برطانیہ کے برطانوی سامراج اور ہندو قوم کی متحدہ قوتوں اور سازشوں کے سامنے سپر ڈال چکی تھی تازہ شیرازہ بندی کے ساتھ دونوں کی مدِ مقابل بن گئی اور اقبال کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ

"ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بڑی زرخیز ہے ساقی"۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری میں سب سے ممتاز شخصیت اقبآل کی ہے۔ اقبال ایک نئی مشرقیت کے علم بردار ہیں۔ وہ حآلی اور اکبر کے جانشین کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کا ادبی مرتبہ ان دونوں سے زیادہ بلند ہے۔ انھوں نے شاعری میں ایک مقدس سنجیدگی پیدا کی ہے اس سے خارا شگافی کا کام لیا ہے، شکوہ خسروی کا درس دیا ہے لہو ترنگ کی جھلک دکھائی ہے، مستیٔ کردار کا ولولہ پیدا کیا ہے اور خاکیوں کو افلاکیوں کے انداز اور آدم کو آدابِ خداوندی سکھائے ہیں۔ مغرب کی ذہنی غلامی مشرق میں عام ہو چکی تھی۔ اقبال نے مشرق کی عظمت کا غلغلہ بلند کیا، مغرب کو اس کے امراض سے آگاہ کیا اور انسانیت کو اس کے فرائض یاد دلائے ہیں۔ اقبآل کی مشرقیت ایک نئی مشرقیت ہے۔ وہ مغرب سے بھی متاثر ہوئے ہیں، مغرب کے اثر سے وہ بہت کچھ بدلے بھی ہیں، مغرب کے اس اثر کو تسلیم کیے بغیر ان کو مشرقیت کا پورا پورا احساس نہیں ہو سکتا۔ وہ مشرقی بھی ہیں اور مغربی بھی۔ انھوں نے دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ ایک دفعہ جوانی میں اور دوسری دفعہ بڑھاپے میں۔ جوانی میں انھیں مغرب کے بعض مفکروں سے فیض اٹھانے، وہاں کے افکار کا جائزہ لینے، وہاں کی تہذیب کو غور سے مطالعہ کرنے اور وہاں

کے ماضی وحال کو سمجھنے کا موقع ملا۔ دوبارہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے وقت انھوں نے فرانس، اٹلی، اسپین اور انگلستان کی سیر کی۔ دونوں سفروں میں فرق تھا۔ پہلے وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے یورپ آئے تھے۔ یورپ نے اپنا علم بھی دیا اور مشرق کا بھی۔ دوسری دفعہ وہ ایک پختہ اور مرتب ذہن لے کر آئے تھے۔ وہ سیکھنے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے نظریوں کے ثبوت میں وہ مثالیں ڈھونڈنے آئے تھے۔ یورپ نے یہ مثالیں بھی فراہم کر دیں۔ اقبال کے فکر کی بنیاد اسلامی ہے۔ ان کا ذہن ان ذہنوں میں سے نہیں تھا جو باہر کی ہر چیز کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ صرف بعض خاص خاص چیزوں کو قبول کر سکتے ہیں جو ان کی فطرت سے مناسبت رکھتی تھیں۔ ان کی شاعری میں اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ عام سماجی، انسانی اور بین الاقوامی مسائل کا احساس بھی ہے۔ محدود وطنیت سے بیزاری اور عالمگیر انسانیت کا قیام اسلام کا خواب ہے۔ مگر جنگِ عظیم کے دوران سینکڑوں زخمیوں کی کراہیں اور سینکڑوں دم توڑنے والوں کی آخری ہچکیوں میں یہ تمنّا بھی شامل تھی۔ اردو شاعری میں اس کا احساس سب سے پہلے اور سب سے شدید طور پر اقبال کو ہوا۔ اقبال کے پہلے دور کی شاعری کی جذباتیت اقبال کو ایک اچھا مصوّر بنا دیتی، ان کا اضمحال رنگین اور ہر حسین خیال کو گلے لگانے کی آرزو ان کو ایک اچھا غنّائی شاعر ثابت کر دیتی، مگر یورپ

کے قیام نے انھیں ایک ذہن دیا۔ ایک محور اور مرکز، ایک نصب العین کی تلاش اور ایک منزلِ آرزو ان میں وہیں پیدا ہوئی، شاعر مفکر وہیں بنا۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ جامع الحیثیات شخصیتوں کے جملہ پہلوؤں پر کماحقہ توجہ نہیں دی جاتی اور ان کا جو پہلو شہرت حاصل کر لیتا ہے وہ دوسرے پہلوؤں کو اُبھرنے نہیں دیتا۔ علاّمہ اقبال کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ وہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک شاعر کی حیثیت سے جو غیر معمولی صورت میں مشہور ہوئے تو نثر نگار کی صورت میں انھیں بہت کم لوگوں نے جانا پہچانا۔ حالانکہ ان کی تحریروں کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ اگر ان سے شعری سرمایہ چھین بھی لیا جائے تو ان کا نثری سرمایہ علمی اور ادبی دنیا میں شہرتِ عام اور بقائے دوام کا ضامن ہے۔

علاّمہ کے متعلق اب تک جو کتابیں اور مضامین شائع ہوے ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس تصنیف کی بدولت پہلی بار مصنّفین کی صف میں شامل ہوئے وہ علم الاقتصاد ہے، جو معاشیات کے موضوع پر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

اقبال نے نثر میں بچّوں کے لیے بھی بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے مختلف مضامین، چند نصابی کتابیں، چند لکچر لطائف کہانیاں وغیرہ۔ مجموعی

طور پر علاّمہ کی نثر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نثر کی حیثیت ثانوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی طرف غیر معمولی توجہ ہونے کی وجہ سے علاّمہ کو نثر لکھنے کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ ان حقائق کی بنا پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ کے کلام کو سمجھنے کے لیے نثر کا مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ بہت سے الجھے ہوئے مسائل جو اشعار میں وضاحت طلب تھے نثر میں واضح طور میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

اقبالؔ کی نظر میں وہ تعلیم و تربیت جو بچّوں کے لیے ہو وہ اس وقت قابلِ تعریف ہے جس کا حاصل کرنے والا باعمل ہو اور شاہین کی صفات کا حامل ہو۔ ایک مقصد کو پالینے کے بعد دوسرے مقصد کا متلاشی ہو اور مشکلات و تکالیف کا سامنا کرنے سے گھبرائے نہیں بلکہ مشکل پسندی کا مظاہرہ کرے، زندگی سے گریز کی راہ اختیار نہ کرے بلکہ کشمکشِ حیات میں بڑھ کر حصّہ لے۔ ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دے، انسانیت کش نہ ہو بلکہ انسان پرور ہو۔ اور یہ مذکورہ صفات اس صورت میں تعلیم و تربیت کی بدولت پیدا ہو سکتی ہیں جب تعلیم کا مقصد ڈگری یا ملازمت حاصل کرنا نہ ہو بلکہ تعلیم علمی ذوق اور اس قرآنی تصوّر کی تکمیل کے لیے حاصل کی جائے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جس نے خود کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا۔ اور خود کو پہچان لینا چونکہ اپنی

شخصیت سے آگاہ ہونا ہے اس لیے اقبال کا تصوّرِ خودی ہی دراصل ان کے تصوّر تعلیم و تربیت کی تشریح و توضیح ہے اور پھر علم کے لغوی معنی ہی چونکہ جاننا کے ہیں اس لیے اس اعتبار سے بھی اقبال کے تصوّرِ خودی کا تعلق علم کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ علم و خودی کے اس تعلق کی وجہ سے ہی دونوں کے بعض فروعی موضوعات جہاں اقبال نے بیان کیے ہیں دونوں میں ہم آہنگی نمایاں ہے۔ جس طرح خودی مستحکم ہونے کے لیے ایک مقصد کے بعد دوسرے مقصد کا ہونا لازمی ہو جاتا ہے جہاں تک کہ مقاصد کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے اسی طرح علم میں اضافہ کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کبھی بھی اپنے آپ کو علم کے اعتبار سے مکمل نہ سمجھے اور ہمیشہ گمان کا شکار رہے۔

اقبال نے اپنے فکر و فن کی تخلیق و تعمیر میں جہاں دوسروں سے بہت کچھ لیا ہے وہاں زمانے کو بہت کچھ دیا بھی ہے ان کی یہ دین اپنے گرد و پیش، یعنی برصغیر کے علاقوں تک محدود نہیں رہی بلکہ بیرونِ دنیا پر بھی اس نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ یورپ، امریکہ، روس، اور ممالکِ اسلامیہ، ہر جگہ ان کے فکر و فن کے مطالعے کو اہمیت دی گئی ہے۔ کلام کے ترجمے ہوئے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی کتب و مقالات لکھے گئے ہیں، خیالات و اسلوبِ سخن کو سراہا گیا ہے اور دنیا کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ان کا شمار کیا گیا ہے۔ عالمی سطح

پر یہ شہرت و مقبولیت برصغیر کے شعراء میں شاید ہی کسی کو میسّر آئی ہو۔ خاص طور پر اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں دنیا کے علمی و ادبی حلقوں کو جس طرح اپنی جانب متوجہ کر لیا اس کی کوئی اور مثال اردو میں نہیں ملتی۔ متعدد کتابیں ان کے متعلق چھپ چکی ہیں سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں اس کے باوجود اقبال شناسی کا حق ادا نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں دنیا کے مسلمانوں نے بالعموم اور برصغیر کے مسلمانوں نے بالخصوص سب سے زیادہ جس شاعر کے متعلق سُنا یا پڑھا ہے وہ بلا شبہہ علاّمہ اقبال ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بلاخوفِ تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اثر کما حقہ صورت میں قبول نہیں کیا گیا ہے۔

کیا گفتار کے غازی مسلمان کردار کے بھی غازی بن چکے ہیں؟ کیا ہم ان کے افکار کے مطابق انفرادی اور ملی سطح پر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ آج کے سمگلروں، ذخیرہ اندوزوں رشوت خوروں، زندگی کے ہر شعبہ میں ملاوٹ سے کام لینے والوں کا طرزِ عمل کیا درندوں سے مختلف ہے؟ کیا ان میں اور جانوروں میں فرق ہے؟ کیا محمود و ایاز بخوشی ایک ہی صف میں کھڑے ہو چکے ہیں؟ کیا مُرید کا گھر بھی پیر کے گھر کی طرح روشن ہو چکا ہے؟ کیا نوجوان اب تن آسانی کا شکار نہیں؟ کیا اب حقیقت خرافات کی نذر نہیں ہوتی؟ کیا مکر کی چالوں سے سرمایہ دار کی جیت نہیں ہوتی؟

کیا اب مزدور انتہائی سادگی سے بات نہیں کھاتا؟ کیا آج کا استاد روایت کے پھندوں میں گرفتار نہیں؟ کیا آج کا مسلمان قرآن کا غوطہ زن ہو کر حدّتِ کردار کا مالک بن چکا ہے؟ یہ سوالات اور اس قسم کے کئی دوسرے سوالات اقبالؔ شناسی کا دعویٰ کرنے والوں اور یومِ اقبالؔ منانے والوں سے خود احتسابی کا تقاضہ کرتے ہیں؟ اگر ان سوالات کے جوابات مثبت انداز میں پیش کیے جا سکتے ہیں اور جوابات میں علم کے ساتھ عمل کی شہادت ملتی ہے تو پھر علاّمہ اقبالؔ سے عقیدت کا دعویٰ درست ہے۔ خود احتسابی کے امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔ لیکن اگر جوابات منفی صورت میں ہیں تو پھر ندامت سے سرنگوں ہونا لازمی ہے۔

ناکامی کے اس قصرِ گمنامی سے باہر نکلنے یا گر کر سنبھلنے کے لیے عزمِ نو اور ولولۂ تازہ کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سہارے اسی صورت میں مفید ہو سکتے ہیں جب احساسِ زیاں ہو۔ اور احساسِ زیاں اس وقت ہوتا ہے جب خود احتسابی کا اصول اپنایا جائے۔ ہم اپنے اقوال اور اعمال کا خود محاسبہ کریں۔ علاّمہ اقبال کا اپنا اندازِ فکر اور طرزِ عمل بھی اسی رجحان کا ترجمان ہے۔ اپنے اشعار اور اپنی تحریروں میں وہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں۔ اپنی شخصیت اور اپنی زندگی کے ہر اچھے یا بُرے پہلو کے متعلق وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ خود احتسابی کی بدولت اپنی

دنیائے عمل میں خوب سے خوب تر کے متلاشی رہے اور ملّت سے ترجمانِ حقیقت، حکیم الامت اور شاعرِ مشرق جیسے القابات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے فن کی عظمت اور ان کے افکار کی بلندی کا راز اسی رجحان میں مضمر ہے۔ اپنے کلام کی صحت و اصلاح، نظرِ ثانی، ردوبدل اور انتخاب کے مراحل سے کامیابی کے ساتھ وہی گزر سکتا ہے جو اپنا محاسبہ کرنے والا ہو۔ فکری اعتبار سے صداقت اور حقیقت تک رسائی اُسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی معلومات کو جانچنے اور پرکھنے والا ہو۔ اقبال ایک ایسے فنکار اور ایک ایسے ہی مفکر تھے۔ شعروں کے علاوہ ان کے مکتوبات میں بھی ان کے اس رجحان کا سراغ ملتا ہے۔

خود احتسابی ایک ایسا عمل ہے جس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنے سے ہم خود شناسی اور خودی سے آشنا ہوتے ہیں۔ اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پاتے ہیں۔ اگر ہم اپنا محاسبہ نہیں کر سکتے، اور جن لوگوں سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں ان کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکتے تو پھر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ماخذات

کُتب

۱ ۔ کُلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال ۔صدی ایڈیشن ۱۹۸۲ء
۲ ۔ اقبال ۔فلسفی اور شاعر	وقار عظیم
۳ ۔ اقبال اور پیروی ِ شبلی	سید افتخار حسین شاہ
۴ ۔ اقبال اور حافظ	یوسف حسین خاں
۵ ۔ اقبال کے ابتدائی افکار	ڈاکٹر عبدالحق
۶ ۔ اقبال کے نثری اصول	ڈاکٹر عبدالغفار شکیل
۷ ۔ اقبال سب کے لیے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۸ ۔ اقبال ۔زندگی ، شخصیت اور شاعری	جگن ناتھ آزاد
۹ ۔ نقوش اقبال	مولوی شمس تبریز خاں
۱۰ ۔ اقبال ۔ایک تجزیاتی مطالعہ	ساحل احمد

۱۱- اطرافِ اقبال	ملک حسن اختر
۱۲- بکھرے خیالات (اقبال کی ڈائری)	ڈاکٹر عبدالحق
۱۳- بچّوں کا اقبال	جگن ناتھ آزاد
۱۴- بچّوں کے اقبال	ڈاکٹر اطہر پرویز
۱۵- بچّوں کا اقبال	عبدالقوی دسنوی
۱۶- منظوماتِ اقبال	رئیس فاطمہ
۱۷- ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی
۱۸- ادبی تنقید۔ مسائل اور تجزیئے	رشید حسن خاں
۱۹- متنی تنقید	ڈاکٹر خلیق انجم
۲۰- تاریخِ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
۲۱- بچّوں کے ادب کی خصوصیات	مشیر فاطمہ
۲۲- اسماعیل میرٹھی۔ حیات اور شخصیت	ڈاکٹر سیفی پریمی
۲۳- اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری
۲۴- تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین

۲۵- ڈاکٹر ذاکر حسین — احسن علی مرزا

۲۶- ڈاکٹر ذاکر حسین۔
سیرت و شخصیت — عبداللطیف اعظمی

۲۷- اردو کی ابتدائی نشوونما
میں صوفیائے کرام کا حصّہ — مولوی عبدالحق

رسائل

۱- ماہنامہ "ماہِ نو"	کراچی - پاکستان	سالنامہ ۱۹۵۰ء
۲- ماہنامہ "فروغِ اردو"	لکھنو	مئی ۱۹۶۹ء
۳- ماہنامہ "آج کل"	دہلی	اپریل ۱۹۷۶ء
۴- ماہنامہ "آج کل"	دہلی	دسمبر ۱۹۷۷ء
۵- ماہنامہ "آج کل"	دہلی	جنوری ۱۹۷۹ء
۶- ماہنامہ "آج کل"	دہلی	اپریل ۱۹۷۹ء
۷- ماہنامہ "آج کل"	دہلی	اکتوبر ۱۹۸۰ء
۸- ماہنامہ "آج کل" ضمیمہ	دہلی	مارچ ۱۹۸۱ء
۹- ماہنامہ "آج کل"	بمبئی	ستمبر ۱۹۶۹ء
۱۰- ماہنامہ "نگار" "اقبال نمبر"	لکھنو	جنوری، فروری ۱۹۶۲ء

۱۱۔ ماہنامہ "تعمیر ہریانہ" چنڈی گڑھ نومبر ۱۹۷۹ء

۱۲۔ ماہنامہ "تعمیر ہریانہ" چنڈی گڑھ اگست ۸۰

۱۳۔ ماہنامہ "کتاب نما" دہلی مئی ۱۹۷۳ء

۱۴۔ "اردو دنیا" دہلی جنوری تا مارچ ۱۹۸۱ء

۱۵۔ "فہرستِ کتب" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی مارچ ۱۹۸۲ء

۱۶۔ اردو ڈائجسٹ "ھما" دہلی۔ "اردو نمبر" اپریل ۱۹۷۳ء

۱۷۔ اردو ڈائجسٹ "ھما" دہلی۔ "اقبالؒ " اگست ۱۹۷۷ء

۱۸۔ "انوارِ ادب" علمی و ادبی مجلہ۔ نگراں زالحسن انور ادیب۔

سالنامۂ بزم اردو فارسی، گورنمنٹ سائنس کالج۔ سالِ اشاعت

چتراُدرگہ۔ درج نہیں۔